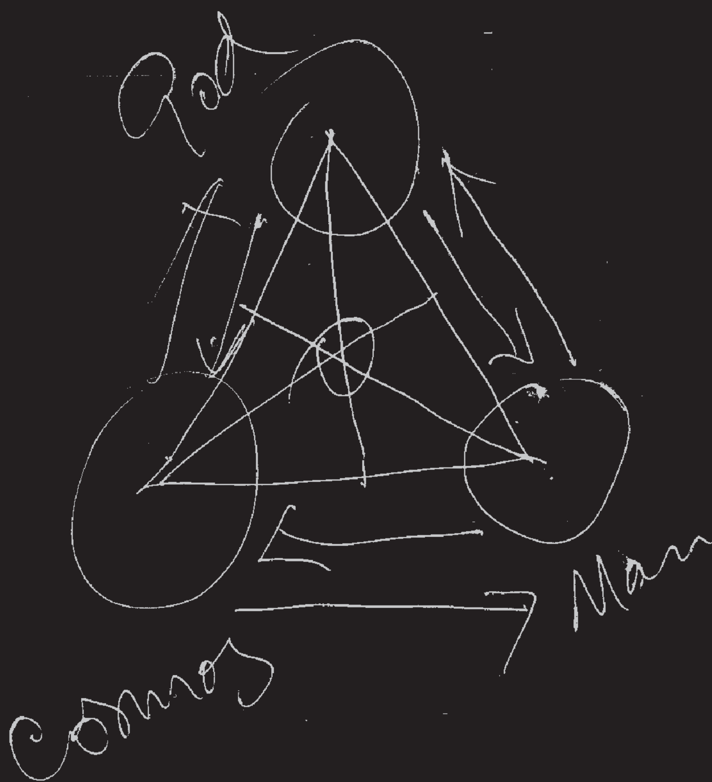


راہِ قوسین

ملفوظاتِ حضرت عبدالقیوم صبا رحمتہ اللہ علیہ

راہِ قوسین

ملفوظاتِ حضرت عبدالقیوم صبا رحمتہ اللہ علیہ

ترتیب وتدوین

رائے منیر احمد بشیر

نام کتاب	راہِ قوسین
ترتیب وتدوین	رائے منیر احمد بشیر
سالِ اشاعت	۲۱۰۳ء
پبلشرز	کہفِ صبا پبلشرز
پرنٹرز	Grafic Skills, Lahore
	19-اے ایبٹ روڈ بالمقابل روزنامہ سعادت لاہور
	فون: 042-36363735

برائے رابطہ

Postal Address	کہفِ صبا، گلستان کالونی، ساہیوال
E-mail Address	kahaf.e.saba@gmail.com
Mobile Number	092-0322-7074109

فہرست

باب پنجم علمی مباحث 65

قال اللہُ تعالیٰ

فَفِرّوا اِلَی اللہ

پس دوڑو اپنے اللہ کی طرف

قال رسولُ اللہِ ﷺ

کُن فی الدُّنیا کَاَنَّكَ غَریب اَو عَابِر سَبِیل

دنیا میں ایسے رہو جیسے کہ ایک غریب یا مسافر

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مشائخِ چشت کے ملفوظات جمع کرنے کی دیرینہ روایت رہی ہے جو حضرتِ اقدس خواجہ عثمان ہرونی رحمۃُ اللہ علیہ کے ملفوظات جمع کرنے سے شروع ہوئی اور یہ روایت تا حال جاری ہے۔ سنتِ نبوی کی پیروی میں خلقِ خدا کی اصلاح کے لئے مجلس آرائی مشائخِ کرامؒ کا معمول رہا ہے جس میں ہر کس و ناکس شریکِ مجلس ہو کر اپنے ذاتی، معاشرتی، شرعی اور روحانی مسائل کا حل پاتے رہے ہیں اور یہی مجالس تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب اور تجلیۂ روح کا ایک مستند ذریعہ رہی ہیں۔ زبانِ شیخ سے جاری ہونے والے جواہر پارے محبین کے لئے ان کی روحانی پیاس بجھانے کا ذریعہ رہے ہیں۔ اسی روایت کو زندہ رکھتے ہوئے ہمارے حضرتُ الشّیخ کی زبانِ فیض رساں سے جاری ہونے والے علوم و معارف برادرِ طریق اور خلیفہ مُجاز جناب رائے منیر احمد بشیر نے جمع کئے اور اس مجموعہ کا نام راہِ قوسین تجویز کیا۔ انتخابِ مضامین نہائت خوبصورت، دقیق اور نازک ہے۔ جس روز مسوّدہ موصول ہوا، دل کو خاص فرحت اور سرور حاصل ہوا۔

دورِ حاضر میں بلا رہنمائی معلومات کی فراوانی فکری انتشار کا ایک بڑا ذریعہ رہی ہے اور اس فکری انتشار میں خاص طور پر نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقہ مبتلا ہو رہا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ اس فکری انتشار اور نفسی اور نفسیاتی پیچیدگیوں کو علم اور ذہانت بھی سمجھا جا رہا ہے۔ دوسری طرف تصوف اور طریقت کے نام پر کئی علمی و عملی کوتاہیاں نہ صرف نظر انداز کر دی جاتی ہیں بلکہ کئی مقامات پر تو تصوف کو ایک آزاد سوچ تک سے تعبیر کیا جاتا ہے جو وحی کی مستند رہنمائی یعنی اسے شرع شریف سے الگ اور خود مختار تک سمجھا اور آگے سمجھایا جاتا ہے۔ ہمارے حضرتُ الشّیخ کا بنیادی نکتۂ نظر فکری اصلاح کی اساس پر قائم تھا۔ آپؒ کی ذاتِ اقدس میں نوجوان اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لئے خاص کشش تھی اسی لئے حضرتِ اقدس کی طرف رجوع اسی طبقہ کا نسبتاً زیادہ رہا اور حضرتِ اقدسؒ بھی قرآنی و حدیثی تصوف کی ترویج و تبلیغ اور فکری انتشار کو رفع کرنے میں ہمہ وقت کوشاں رہے۔ راہِ قوسین انشاء اللہ اُس فکری انتشار اور نفسی و نفسیاتی پیچیدگیوں سے نجات کا ذریعہ ثابت ہوگی۔ اِن ملفوظات سے حضرت کی مجددانہ شان

بھی واضح ہوتی ہے اور انشاءاللہ اس سے ہدایت کی راہیں کھلیں گی۔ یہی بنیادی مطمحِ نظر مشائخ کی اپنی موجودگی کا بھی رہا ہے اور ملفوظات بھی مشائخِ کرامؒ کی صحبت کا نعم البدل ہوتے ہیں کیونکہ اُن کے الفاظ میں بھی اُن کے انفاسِ قدسیہ کی مہک ہوتی ہے۔ راہِ قوسین سے انشاءاللہ ہر خاص و عام مستفیض ہوتا رہے گا۔ برادرِ طریق اور خلیفہ ٔ مُجاز رائے منیر احمد بشیر کی اس کاوش کو اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں اور ہم سب کے لئے اسے نافع بنائیں۔ آمین ثم آمین!

رانا امتیاز حسین

خلیفہ ٔ مُجاز حضرتِ اقدس عبدالقیوم صاؔبا

شجرۂ طیبہ چشتیہ نظامیہ صابریہ امدادیہ

خاتم النبیین رحمۃ للعالمین وسیلۃ السالکین سکینۃ الطالبین سیدنا حضرت محمد مصطفٰے ﷺ

امامُ الاولیاء سرچشمۂ فیضِ عینیت سیدنا حضرت علی المرتضٰی کرّم اللہ وجھہ

امام الاتقیاء والاصفیاء حضرت خواجہ حسن بصری علیہ الرحمتہ

حضرت خواجہ عبدالواحد علیہ الرحمتہ

حضرت خواجہ فُضیل بن عیاض علیہ الرحمتہ

حضرت خواجہ ابراہیم بن ادھم علیہ الرحمتہ

حضرت خواجہ حذیفہ مرعشی علیہ الرحمتہ

حضرت خواجہ ہبیرہ بصری علیہ الرحمتہ

حضرت خواجہ حبیب عجمی علیہ الرحمتہ

حضرت خواجہ داؤد طائی علیہ الرحمتہ

حضرت خواجہ معروف کرخی علیہ الرحمتہ

حضرت خواجہ سرّی سقطی علیہ الرحمتہ

حضرت خواجہ جنید بغدادی علیہ الرحمتہ

حضرت خواجہ ممشاد علوی دینوری علیہ الرحمتہ

حضرت خواجہ ابواسحاق شامی علیہ الرحمتہ

حضرت خواجہ ابواحمد سلطان علیہ الرحمتہ

حضرت خواجہ ابومحمد علیہ الرحمتہ

حضرت خواجہ ناصرالدین علیہ الرحمتہ

حضرت خواجہ قطب الدین مودود علیہ الرحمتہ

حضرت خواجہ شریف منیرالدین علیہ الرحمتہ

حضرت خواجہ عثمان ہرونی علیہ الرحمتہ

حضرت خواجہ غریب نواز معین الدین علیہ الرحمتہ

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی علیہ الرحمتہ

حضرت خواجہ فریدالدین مسعود گنج شکر علیہ الرحمتہ

حضرت خواجہ نظام الدین محبوبِ الٰہی بخاری علیہ الرحمتہ
حضرت خواجہ علی بن احمد صابر کلیری علیہ الرحمتہ
حضرت خواجہ نصیر الدین محمد چراغ دہلوی علیہ الرحمتہ
حضرت خواجہ شمس الدین تُرک علیہ الرحمتہ
حضرت خواجہ سید جلال الدین بخاری علیہ الرحمتہ
حضرت خواجہ جلال الدین عثمانی علیہ الرحمتہ
حضرت خواجہ میراں اجمل بہرائچی علیہ الرحمتہ
حضرت خواجہ عبدالحق ابدالی علیہ الرحمتہ
حضرت خواجہ بڈھن بہرائچی علیہ الرحمتہ
حضرت خواجہ احمد ہارون فاروقی علیہ الرحمتہ
حضرت خواجہ درویش بن محمد قاسم علیہ الرحمتہ
حضرت خواجہ محمد فاروقی علیہ الرحمتہ

حضرت خواجہ عبدالقدوس گنگوہی علیہ الرحمتہ
حضرت خواجہ جلال الدین تھانیسری علیہ الرحمتہ
حضرت خواجہ نظام الدین بلخی علیہ الرحمتہ
حضرت اقدس ابوسعید نعمانی گنگوہی علیہ الرحمتہ
حضرت اقدس محبّ اللہ فاروقی علیہ الرحمتہ
حضرت اقدس سید شاہ محمد اکبر آبادی علیہ الرحمتہ
حضرت اقدس سید شاہ محمد المکی جعفری علیہ الرحمتہ
حضرت اقدس سید عضد الدین علیہ الرحمتہ
حضرت اقدس سید عبدالباری امروہوی علیہ الرحمتہ
حضرت اقدس عبدالباری صدیقی علیہ الرحمتہ
حضرت اقدس عبدالرحیم شہید ولائتی علیہ الرحمتہ
حضرت اقدس میاں جیؤ نور محمد علوی علیہ الرحمتہ
حضرت اقدس حاجی امداد اللہ مہاجر مکی علیہ الرحمتہ
حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمتہ
حضرت اقدس سید سلیمان ندوی علیہ الرحمتہ
حضرت اقدس ڈاکٹر غلام محمد حیدر آبادی علیہ الرحمتہ
حضرت اقدس پروفیسر عبدالقیوم صبا علیہ الرحمتہ

خلافت نامہ

باسمہ تعالیٰ شانہ

غلام محمد

مورخہ ۱۷ جمادی الثانی ۱۴۰۲ھ
۲۱ اپریل ۱۹۸۲ء

۲۹۵ - بلاک ۷ و ۸
سی پی برار سوسائٹی
کراچی ۵

اعز الاحباب پروفیسر عبد القیوم صاحب
وفقکم اللہ تعالیٰ لما یحب ویرضاہ وایدکم بروح منہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

طریق سے مناسبت اور ضروریات فن سے واقفیت نیز اپنے قلبی داعیہ کی
بنا پر دوران قیام ساہیوال دوشنبہ ۸ جمادی الثانی ۱۴۰۲ھ (۲ اپریل ۱۹۸۲ء)
والی شب کو مشافہۃً آپ کو اپنے سلسلۂ مشترکہ میں اخذ بیعت کی اجازت
توکلاً علی اللہ دے چکا ہوں اور اب تحریراً اسی کی توثیق کر رہا ہوں
اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ اور اسکے نفع لازم و متعدی دونوں سے
آپ کو فیض یاب و فیض رساں رکھے۔

اپنی ساری ناکارگی کے باوجود فریضۂ منصبی کے پیش نظر عاجزانہ وصیت
یہی ہے کہ اہتمام تقویٰ۔ التزام اتباع سنت مطہرہ اور دوام ذکر و فکر آخری
سانس تک قائم رہے اور اسی کی تلقین اور اسی کا توصیہ ہوتا رہے۔

والسلام

احقر الانام وخاکپائے سلیمانؒ

غلام محمد عفی عنہ

۱۷-ج۲-۱۴۰۲ھ

راہِ قوسین

(ملفوظات)

باب اوّل

مقامِ رسالت

ا۔ آپ ﷺ کو تمام زمینوں اور زمانوں کے لیے رحمت بنایا گیا۔ آپ ﷺ رحمت اللعالمین ہیں اور عالمین میں کوئی چیز ایسی نہیں کہ اُن ﷺ کی برکت کے بغیر کسی کا دُکھ دور ہو جائے۔ چیزوں کو مادی وجود بھی اُن ﷺ کے فیضان سے ملا تو پھر باقی اور کیا رہ گیا! سب سے قیمتی چیز اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے۔ اللہ کے اللہ ہونے کا شُعور اور اللہ سے محبت بھی آپ ﷺ کے نور کی برکت ہے۔ سینے میں ایمان کی چنگاری اسی نور کی برکت ہی کی وجہ سے ہے۔ قرآنِ کریم آپ ﷺ پر تو لوحِ محفوظ سے آیا ہو گا لیکن ہم تک تو آپ ﷺ کے قلبِ اطہر سے آیا ہے۔ ہماری لوحِ محفوظ تو آپ ﷺ کا قلبِ اطہر اور ہمارے جبرئیل تو آپ ﷺ کی زبانِ مبارک ہیں۔ آیاتِ مبارکہ آپ ﷺ کے قلبِ اطہر سے گزر کر آتی ہیں اسی لئے تو چھ سال کا بچہ بھی برداشت کر لیتا ہے ورنہ پرخچے اُڑ جائیں۔ آیاتِ کیونکہ آپ ﷺ کے قلب مبارک سے آتیں ہیں تو جس کے سینے میں دِل ہو گا صرف اسی کے دِل میں آئیں گی۔ دِل کی چیز تو دِل سے دِل میں آئے گی۔ جس کے سینے میں قرآن پاک نہیں آیا تو دراصل اس کا دِل دِل ہی نہیں! دِل کا مطلب یہ physical organ نہیں۔ دِل اور زندگی کا مفہوم کچھ اور ہے۔ جب قرآنِ کریم میں فرمادیا گیا کہ من کان حیّ تو یہ والی زندگی جو آیتِ مبارکہ میں بیان کی گئی ہے کوئی اور چیز ہوئی۔ مُردے کو آپ بجلی کا جھٹکا بھی دے لیں تو اسے کچھ اثر نہیں ہو گا۔ دِل والوں کے پاس جا کر یہ ہوتا ہے کہ دِل زندہ ہو جاتا ہے۔ قرآن کے علوم و معارف کو receive کرنے والی چیز تو قلب ہی ہے۔

اُن ﷺ کی رحمت اللعالمینی صرف اپنی امت پر ہی نہیں بلکہ ہر انسان، ہر جانور اور ہر پتھر پر ان ﷺ کی رحمت اللعالمینی چھائی ہوئی ہے جس کی وجہ سے وہ چیز موجود ہے۔ آپ ﷺ کے کرنوں کی تاثیر ہے کہ کالے ذرے بھی چمک اٹھے ہیں۔ مادی وجود بھی وہیں سے ملا اور کلمہ کی توفیق بھی انہی ﷺ کا فیضان ہے۔ اگر آپ ﷺ کا فیضان نہ ہو تو ہم جیسے نماز کیسے پڑھ رہے ہوتے؟! ہماری ایمانیات میں تو کلنٹن کو بھی پانی کا گھونٹ آپ ﷺ کی جوتیوں کے طفیل ملتا ہے۔ آپ ﷺ کے تشریف لانے سے

پہلے کسی بھی نبیؑ کے امتیوں کی سرکشی پر ان کے لئے عذاب نازل کر دیا جاتا۔ کسی بھی نبی کے امتی اور غیر امتیوں کے کُل گناہ، اور ہم میں سے ایک ایک کے گناہ اُن سے زیادہ ہیں لیکن ہم پر عذاب کیوں نہیں آتا؟ کیونکہ ہمارے اور اللہ کے غضب کے درمیان آپ ﷺ کا وجودِ اطہر ہے۔ ہمیں مہلت صرف آپ ﷺ کی رحمت اللعالمینی کی بدولت ہے۔ اگر رحمت درمیان میں نہ ہو تو پھر موت ہے۔ موت اور کس چیز کا نام ہے!

۲۔ علامہ اقبال صاحب کا ایک شعر ہے کہ

معنیٔ دیدارِ آں آخر زماں؟
سرِ او بر خویشتن کردن رواں
باز خود را بیں ہمیں دیدارِ اوست
سُنتِ اُو سرِّ از اسرارِ اُوست

اپنی ذات، وجود اور شخصیت میں، جذباتی ذہنی رویوں میں اور جسم کے ظاہری اور باطنی سانچوں میں آپ ﷺ کی اداؤں کے رنگ کو جذب کر لیا ہے تو جب اپنے آپ کو دیکھو گے تو دراصل ان ﷺ ہی کو دیکھو گے۔ پھر یہ ہو جائے گا کہ یہ جو میں وضو کر رہا ہوں اُسی طرح کا ہے جو آپ ﷺ فرماتے تھے، تو یہ تو ان ﷺ کا ہی وضو ہوا۔ آپ ﷺ کے عکس کو دیکھنا خود آپ ﷺ کو دیکھنا ہے، کیونکہ عکس بھی تو شخص ہی کا دیدار ہے۔ جب روحِ انسانی کو قربِ روحِ نبوی مل جاتا ہے تو پھر وہ شخص اپنے کان سے نہیں سنتا، کسی اور کے کان سے سنتا ہے یعنی اپنے محبوب کے کان سے۔

کاش تجھ کو تری آنکھوں سے بھی دیکھا ہوتا!

اپنی آنکھ سے بھی دیکھنا ہے اور ان ﷺ کی آنکھ سے بھی۔ یہ ہے فنا فی الرّسول ہونا! جب یہ ہو لے گا تو پھر اپنے اندر اور باہر رسالت کی شانوں کا مشاہدہ ہوگا۔ اپنا یا کسی اور شے کا مشاہدہ بالکل minus ہو جاتا ہے۔ پھر وہ شخص جدھر بھی دیکھ رہا ہو دل کی نگاہ اُسی طرف ہی رہتی ہے اور کوشش کے باوجود بھی اپنی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ پانی میں چاند کی ٹکیہ ہو تو وہاں پانی نظر آئے گا یا کرنیں نظر آئیں

گی؟!اسطرح جمالِ نبوی کا جذب وانجذ اب ہوتا ہے۔ ویسے تو سارے پانی میں کرنوں کی جھلملاہٹ ہوتی ہے لیکن جہاں ٹکیہ ہو وہاں اور ہی صورتِ حال ہوتی ہے۔ جب میری کُل I-ness میں محمد پن ہوگیا تو پھر میں نہ رہا، اور محمد پَن میں اللہ پَن تو already موجود ہوتا ہے۔

اب نہ کہیں نِگاہ ہے، اب نہ کوئی نِگاہ میں
محو کھڑا ہوا ہوں میں حُسن کی جلوہ گاہ میں

۳۔ آپ ﷺ کا اصولِ تخلیق 'نوریت' ہے۔ لیکن نورِ محمدی معلومِ حق ہے اور ذاتِ محمدی ﷺ مخلوق۔ آپ ﷺ کے نورِ اقدس کا ایک معنوی فیضان ہے اور ایک حسی فیضان ہے۔ معنوی فیضان میں ایک قرآنِ کریم ہے اور ایک آپ ﷺ کا اُسوۂ حسنہ۔ یہی وہ مشرب ہے جو میرے مُرشد ڈاکٹر غلام محمدؒ سے مجھ تک پہنچا۔

۴۔ آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی کے چار حقوق ہیں:

ا۔ معرفت۔ اُن ﷺ کی شانِ مبارکہ کی صحیح واقفیت۔ علمی حقائق جب قلبی سطح پر آجاتے ہیں تو معرفت کہلاتے ہیں۔

ب۔ محبت

ج۔ عظمت

د۔ اطاعت ومتابعت

ان چار میں سے کوئی ایک بھی سچی اور پوری ہو جائے تو باقی تین ہو کے رہیں گی۔ اگر تین نہیں ہوئیں تو پھر ایک بھی صرف کہنے کی حد تک ہے، حقیقت میں وہ نہیں ہے۔ بس ادائے حقوق کا عزم رکھیں، یہی ایمان ہے۔

۵۔ آپ ﷺ کا نورِ مبارک سب سے پہلے تخلیق کیا گیا اور باقی تمام موجودات اس

نورِ مبارک سے تخلیق کی گئیں۔ سمجھدار کے لئے تو یہ دو آیاتِ مبارکہ ہی کافی ہیں کہ وما ارسلنٰك الّا رحمت اللعالمین اور ورفعنا لكَ ذكرك۔ Created چیز کو عالَم کہتے ہیں اور لفظِ اللعالمین میں کونسی چیز ہے کہ جسے minus کریں گے۔ جنت، دوزخ، ماضی، حال، سعودی عرب، امریکہ سب عالَم ہیں اور آپ ﷺ اِن تمام کے لئے رحمت۔ بحث تو آپ ﷺ کی فوق البشریّت کی ہے اور پیغمبری فوق البشریّت ہی ہوتی ہے۔ حقیقتِ محمد یہ عالَم ہے اور ذاتِ محمد یہ ﷺ معلوم۔ یہ وحدتُ الوُجود کا باریک نکتہ ہے، یہ نہیں سمجھیں گے تو شرک ہو کے رہے گا۔ ذاتِ نبوی ﷺ بھی ممکِن ہے، واجِب نہیں۔ لیکن اِس ممکنیّت کی حقیقت کچھ اور ہے۔ یہ تو حضرت مجدّد صاحبؒ کو بھی لکھنا پڑا۔

٦۔ آپ ﷺ کے کمالات پر گنتی نہیں لگتی۔ جہاں گنتی ختم ہوتی ہے وہاں سے ان کا مقام شروع ہوتا ہے، اور غیرِ خدا آپ ﷺ کے کمالات کی ہوا بھی نہیں پا سکتا کیونکہ نبی را خدا می شناسد۔ اِلٰہ ہونے کی اپنی شان ہے اور محبوبِ اِلٰہ ہونے کی اپنی شان۔ حضرتِ والاؒ فرماتے ہیں کہ

ہمہ عالَم رضائے حق جوید

حق رضائے تُو یا رسول اللہؐ

آپ گواہ رہیے کہ میرا عقیدہ و ایمان یہی ہے جو حضرت حاجی امدادُ اللہ مُہاجر مکّیؒ نے نعت شریف میں فرمایا کہ

محمدؐ کی مرضی ہے مرضی خدا کی

٧۔ ذاتِ نبوی ﷺ قرآنِ کریم کی embodiment ہے۔ قرآنِ کریم ایک abstraction ہے اور اس کی embodiment آپ ﷺ ہیں۔ شیخِ اکبر حضرت محی الدین ابنِ عربیؒ نے فتوحاتِ مکیّہ میں تحریر فرمایا کہ قرآنِ پاک میں دیکھنا عین محمد ابنِ عبداللہ ﷺ میں دیکھنا ہے اور محمد ابنِ عبداللہ ﷺ میں دیکھنا عین قرآنِ پاک میں دیکھنا۔

۸۔ دین کی ہر بات درحقیقت کیا ہے؟ محمدیّت! نماز، روزہ، ذکر، غرضیکہ ہر بات آپ ﷺ سے ہے تو دین نام ہی محمدیت کا ہے۔ مسلم ہونے کی definition ہی یہی ہے کہ محمدی ہو جانا۔ جنابِ حق تعالیٰ سے لذتِ ہمکلامی کا آپ ﷺ کو ایک شوق اور انتظار تھا کہ کب پیامِ یار آئے۔ یہی روزہ کی حقیقت ہے کہ انسانی قلب و روح ایک تخلیقی اضطراب اور شوق و انتظار میں زندہ ہو یعنی آپ ﷺ جن احوال و کیفیات سے گذر رہے تھے، اُن احوال و کیفیات کی recreation کا نام ہے صوم۔ حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ نے فرمایا کہ

روزہ حفظِ دل از خطرات

بعد ازاں مشاہدہ افطار

۹۔ موجودات میں کا ہر موجود ایک ذرّہ ہے اور سارے ذرّوں پر آفتابِ جمالِ نبوی کی کرنیں پڑ رہی ہیں اور وہ کرنیں لوٹتے ہوئے پکارتی ہیں کہ 'نورِ آفتاب بڑھے، نورِ آفتاب بڑھے'، اس درخواست کو درودخوانی کہتے ہیں۔ آفتاب کی روشنی جتنی بڑھے گی ذرّہ مزید روشن ہوتا جائے گا۔ آفتابِ جمالِ نبوی کی چمک تو جنابِ حق تعالیٰ ہر لمحے بڑھا ہی رہے ہیں لیکن ہمارے کہنے سے ہم بھی اُس میں شامل ہو جاتے ہیں، یہ ہمارے لئے فیض کی بات ہے۔ درود شریف مرکز سے اپنے رابطوں کا اقرار ہے۔ مرکز یعنی ذاتِ رسول ﷺ پر جو عنائتِ ربانی ہے، ذرّہ درودخوانی سے اس بات کا شُعور حاصل کرتا ہے کہ اِس کا وجود مرکز سے قائم ہے۔ آسمان کے سورج کا عکس اگر پانچ لاکھ جھیلوں میں اتر آئے اور جھیل کے پانی میں جو سورج کی ٹکیہ ہے وہ اس سورج کی طرف متوجّہ ہو کر خدا سے یہ درخواست کرے کہ نورِ آفتاب اور بڑھے تو اس دعا درخواست سے خود یہ عکس روشن تر ہوتا جائے گا۔ جھیل میں سورج کی ٹکیہ انسانی روح ہے۔ انسان کی حقیقت روح ہے، اور روح کی حقیقت آپ ﷺ۔ ہماری ارواح کی حقیقت تو روحِ محمدی ہے جو آفتابِ جمال ہے اور آفتابِ جمال کی حقیقت انکشافِ وجہہ حق ہے۔

۱۰۔ آپ ﷺ کی نوریت اور بشریت کا بھید عبدہٗ و رسولہ میں ہے۔

عبدہٗ بشریت ہے اور رسولہ 'نوریت۔ اور نوریت مابعد الطبیعی (metaphysical) ہے کیونکہ اس میں biology and chemistry کا کوئی عمل دخل نہیں۔ خدا تعالیٰ نے قرآنِ کریم کو بھی نور کہا اور مؤمنین کے لئے بھی لفظِ نور آیا ہے۔ جب اہلِ ایمان کے لئے بھی نور کا لفظ آیا ہے تو ہمیں کچھ خدا خوفی کرنی چاہیے کہ آپ ﷺ کی نوریت کا انکار نہ کریں جو کہ اکثر لوگ کرتے ہیں۔ جن کی رسالت سے اہلِ ایمان کو نور کہا گیا وہ خود نور کیسے نہیں ہوں گے! لیکن ان ﷺ کی نوریت کے معنی یہ نہیں کہ جیسے tube-lights یا چراغ کا نور ہوتا ہے۔ لفظ سے جو مقصود ہو پہلے اس لفظ کو define کرلیا کریں۔ نور سے مراد یہ ظاہری روشنی نہیں بلکہ وہ نوریت تو غیر طبیعی ہے۔ جب وہ ہے ہی غیر طبیعی تو پھر انکار کیسا! اگر معجزات کا انکار نہیں تو پھر نوریتِ رسول کا انکار کیوں! اب لوگ ساری باتوں کو حسی سطح پر سمجھنا چاہتے ہیں اور اس mentality سے یؤمنون باالغیب کا تو اڈا ہی اُڑ جاتا ہے۔ لوگ بات کو حالات کے تابع رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، حالات کو اصول و قوانین کے تابع نہیں رکھتے۔ درود شریف کا پڑھنا، سوچنا، آواز خود ایک نور ہے۔ سب سے پہلا اور سب سے عظیم نور آپ ﷺ کا نور ہے۔ باقی تمام نور آپ ﷺ کے نور سے پیدا ہوئے ہیں۔ چاندنی، اچھائی، نیکی، تقوٰی۔ حسی اور معنوی جو کچھ ہے سب وما ارسلنٰكَ الاّ رحمة للعالمین میں داخل شامل ہے۔ رحمة للعالمینی اور وصل اللہ علٰی نور کز و شد نور ھا پیدا ایک ہی بات ہے۔

۱۱۔ آپ ﷺ کے اختیار کی نفی در حقیقت اللہ کے اختیار کی نفی ہے۔ کیا خدا کے پاس کسی کو با اختیار بنانے کا اختیار نہیں؟! قادرِ مطلق کا مطلب ہی یہ ہے کہ اپنی مرضی سے جس کو مرضی اور جتنا مرضی اختیار دیں۔ جس کو اختیار دیا گیا ہوتا ہے اسے پتہ ہوتا ہے کہ مری اصل تو خالی پن ہے بس دینے والے نے اختیار دے دیا سو دے دیا۔ آپ ﷺ کو پھر اتنا ایسا اختیار عطا کیا گیا کہ آپ ﷺ کے لئے انّا اعطینٰك الکوثر، ورفعنا لك ذکرك، ولسوف یعطیك ربك فترضٰی فرمایا گیا۔ ان پہ غور کریں کہ کتنا کیسا اختیار آپ ﷺ کو دیا گیا ہوگا۔ ختمِ نبوت کے معنی اگر

آ جائیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ خاتم النبیین کے معنی ہیں آخری بلندی یعنی بلند ترین چوٹی۔ آپ ﷺ کی نبوت اصل ہے اور باقی انبیاء کرامؑ کی نبوت اُن ﷺ کا عکس۔ اب لفظِ نور نہ مان کر کیا حاصل ہوگا! آپ ﷺ کی نوریت اور اختیار کا اقرار تو شانِ رسالت کا اقرار ہے۔ ہم شانِ نبوت کہہ رہے ہیں شانِ ربوبیت نہیں کہہ رہے۔ شانِ الوہیت نہیں کہہ رہے بلکہ شانِ رسالت کے اقرار کی بات کر رہے ہیں۔ اب لوگ آپ ﷺ کو ایک اپنے جیسا بشر ہونے کی باتیں کرتے ہیں اور اس آیتِ مبارکہ کا reference دیتے ہیں کہ انا بشر مثلکم جب کہ اسی آیتِ مبارکہ کا دوسرا ٹکڑا ہے الا ما یوحی الی یعنی بس نظر آنے کے اعتبار سے تمہیں نظر آ رہا ہوں لیکن میری اپنے خدا سے براہِ راست گفتگو ہے۔ الا کے معنی ہیں 'لیکن' اور موضوعِ سخن لیکن کے بعد ہوتا ہے۔ اب جو لوگ صرف الا کے بعد والے حصے پر چلتے ہیں اور پہلے حصے کا انکار کرتے ہیں تو یہ روش بھی غلط ہے۔ جب پہلا حصہ بھی آیتِ مبارکہ ہے تو اس کے انکار سے کیا حاصل۔ ویسے آپ ﷺ کی بشریت صرف صورتاً مشترک ہے ورنہ آپ ﷺ کی بشریت ایک علیحدہ حقیقت ہے۔ جب آپ ﷺ نے فرمادیا کہ ایّکم مثلی تو بات ثابت ہوگئی کہ بشریت میں بھی بس لفظی اور اسمی اشتراک ہے۔ حقیقی معنوی اشتراک نہیں صرف لُغوی تشبیہی اشتراک ہے۔ اللہ اور بندے کے درمیان آپ ﷺ ایک پُل ہیں اس لئے آپ ﷺ کو برزخِ کُبریٰ کہا جاتا ہے۔ ایک کڑی ہے کہ جس کا اوپر والا سرا حق سے مِلا ہوا ہے اور نیچے والا خلق سے اور نیچے والے سَرے کے خلق کو ملے ہونے کو بشریت کہتے ہیں۔ نبی بندوں کا ہاتھ پکڑتا ہے اور اللہ کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ بندے کے ہاتھ اتنے لمبے نہیں کہ اللہ تک پہنچ سکیں۔ خدا تعالیٰ چاہیں تو پہنچ سکتے ہیں لیکن اللہ کی چاہنیت یہی ہے کہ نبی کے ذریعے ہی پہنچے گا جو پہنچے گا۔ اگر کوئی فرشتہ یا جن درمیان میں ہوتا تو jealousy نہ ہوتی لیکن جنہوں نے آپ ﷺ کو تسلیم نہیں کیا انہیں آپ ﷺ سے رقابت تھی اور یہ خواہش کہ ہم میں سے کوئی اس stature کا ہوتا۔ امامتِ انبیاء کا شرف آپ ﷺ کو حاصل ہوا۔ آپ ﷺ کی مرضی اور خدا کی رضا الگ نہیں۔ خدا کی مرضی آپ ﷺ کی رضا اور آپ ﷺ کی مرضی خدا کی رضا۔ بس یہ عقیدہ رکھیں اور جو یہ نہ رکھے وہ جس فرقے کا بھی ہو وہ اسی دنیا میں ذلیل ہو کر مرے گا، آخرت کی بات تو بعد میں ہوگی۔

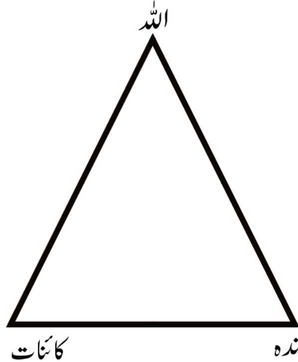
درود شریف ۔ سیدنا غوث الاعظم
عبدالقادر جیلانیؒ

اللّٰھم صلِّ وسلّم علی سیّدنا محمّدِ الّذی تاھت
فی انوار جلالہٖ اولوا العزم من المرسلین
وتحیّرت فی درک حقائقہٖ عظماء الملائکۃ
المھیّمین ۔ روح ارواح عبادک
ومحلّ اسرارک ومنبع انوارک

درود شریف ۔ سیّدنا غوث الاعظم عبدالقادر جیلانیؒ

عقائد اور فنِ تصوف

۱۔ عقائد وایمانیات کی حقیقت کیا ہے؟ قلب کے عقلی اور ارادی فیصلے! یہی فیصلے انسان کے عقائد وایمانیات ہیں۔آپ کے عقل وشُعور نے کسی چیز کی کیا definition مقرر کی، کیا decision لیا اور کیا judgement کی، وہی آپ کا عقیدہ ہے۔قرآنِ پاک میں جنابِ حق تعالیٰ فرمائے کہ فما ظنُّکم بربِّ العٰلمین۔اللہ کا بندوں سے اور بندوں کا اللہ سے کیا تعلق ہے،اس کے بارے میں فیصلہ ہی عقیدہ کہلاتا ہے۔کل اعتقادیات بس یہ ہے۔ سارا قرآن وحدیث اس ایک مثلث سے متعلق ہے کہ اللہ، بندہ اور کائنات میں کیا ربط ہے۔



۲۔ آجکل اپنے نظریاتی اور تصوّراتی خدا کا نام حقیقی خدا رکھ لیا گیا ہے۔ اہلِ حدیث، دیوبندی، بریلوی، نظامی، قادری تو ہم ہیں، جنابِ حق تعالیٰ تو نہیں۔ ہم حق تعالیٰ کی صفات کو اپنی صفات پر قیاس کرتے ہیں اور یہ عقیدے کی بات ہے کہ ذات وصفات میں وہ وحدہٗ لاشریک ہیں۔ ایک یہ سوچ بھی prevail کرگئی ہے کہ نبی عام انسانوں جیسے ہی ہوتے ہیں۔ایسے لوگوں کو نبی بنے بغیر کیسے پتہ لگ گیا کہ نبوّت کیا ہوتی ہے۔ جبکہ شاعر ہوئے بغیر شاعر ہونے کا پتہ تو لگ نہیں سکتا، نبوّت کی تو بات ہی الگ ہے۔ مادرزاد اندھے رنگوں کا کیا پتہ چلائیں گے! بندے کا کِبر یہی ہے کہ میں نہیں تو پھر اور کون، اور کیوں، اور کیسے؟! شخصی، ذاتی، نجی، انفرادی۔ ان چار الفاظ سے جب تک

چھٹی نہیں ملے گی تب تک منزل کا سوال ہی نہیں۔ روحانی تجربوں میں اللہ کی ذات کے بارے میں جو انکشافات ہوں، اس پر بھی لا پھیرنا ہے کہ خدا کی حقیت تو صرف خدا کو معلوم ہے۔ حضرت جُنید بغدادیؒ کو روحانی سفر میں روح کا جمال منکشف ہوا اور آپؒ اسے جلوۂ ربّانی سمجھ کر عبادت کرتے رہے، پھر حقیقت کا انکشاف ستّر سال بعد ہوا۔ اور اب تو عالَم مثال کی کئی چیزوں کو عالَمِ ارواح کی چیزیں سمجھا جا رہا ہے۔ خوابوں میں بھی جو عالَم منکشف ہوتا ہے وہ عالَمِ مثال ہے۔ انسان کے روحانی سفر میں شیاطین اپنا تصرّف کرتے ہیں اور لوگ اس شیطانی تصرف کو بھی روحانی کہے جا رہے ہیں اور اس قدر پاگل ہو گئے ہیں کہ مُراقبات واشغال کے دوران نظر آ جانے والے رنگوں اور سنائی دی جانے والی کچھ پراسرار موسیقیت کو سب کچھ سمجھ لیتے ہیں جبکہ یہ سب کچھ نفسانیت ہے۔ تصوف تو ہوش مندی کا کام ہے۔ حقیقی حضوری تو ہوش مندی ہے۔ کچھ سُرور بھی آتا ہے لیکن یہ by product ہے۔ حضرت تھانویؒ نے تو یہ علاج فرمایا کہ ایسی تمام باتوں سے بے نیاز ہو کر اللہ کی عبادت میں لگے رہو۔ حضرتِ والاؒ فرماتے تھے کہ

'اللہ کا نام سلانے کے لئے ہے یا جگانے کے لئے!'

۳۔ اجمالی معرفت کے بغیر محبت کا آغاز نہیں ہو سکتا اور محبت بڑھے بغیر تفصیلی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔ محبت کی ابتدا ہو کے اسکی ترقیوں کے بغیر معرفت ہو گی ہی نہیں۔ اس لئے محبت اور معرفت ایک ہیں۔ اصل میں یہ دو لفظ ہی نہیں ہیں۔ محبت عین معرفت ہے اور معرفت عین محبت۔ یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ اصلِ اصول ہے۔ کائنات کا خمیر محبت سے اٹھایا گیا ہے۔ حیات و کائنات اصولِ حُبّی کا اظہار ہیں اور اس کی بڑی نشانیوں میں سے بڑی نشانی معرفت ہے۔ چشتیوں کا تو سب کچھ عشق و محبت اور وہی عین معرفت ہے۔

علم نبوَد جز بعلمِ عاشقی
ما بقا تلبیسِ ابلیسِ شقی

۴۔ کوئی مجھ سے پوچھے کہ حاصلِ تصوف کیا ہے تو میرا جواب یہ ہے کہ اعترافِ قصور! یعنی اپنی خطاؤں اور تقصیروں کا شعور و اقرار۔ اپنی عمر بھر کی ادھیڑ بن کا حاصل یہی ہے۔ رضی اللہُ عنہ ہونا تو ہماری اوقات ہی نہیں۔ فنِ حصولِ قرب و معیت تصوف ہے لیکن اکابرین کا۔ ہمارے لئے تو تصوف اعترافِ قصور ہی ہے۔

۵۔ مولا کا بندے سے اور بندے کا مولا سے تعلق اور حقائقِ غیبیہ کی پہچان اور اُن سے رابطہ۔ دین اور تصوف بس اتنی بات کا نام ہے!

۶۔ نفسِ مطمئنہ کا مطلب ہے اندر کے تضادات کا ختم ہو جانا۔ اگر حضوری نہیں ہو گی تو فنا حاصل نہیں ہوگی۔ فنا نہیں ہوگی تو معرفت حاصل نہیں ہوگی۔ اور معرفت نہیں ہوگی تو تضادات نہیں جائیں گے۔ جس نے انا کی کال کوٹھڑی سے باہر آنا نہیں سیکھا، اس کے پلّے کچھ نہیں۔ تضادات ہمیشہ انا گزیدگی سے جنم لیتے ہیں۔

۷۔ پہلا باب تصوف کی ہر مستند کتاب میں علم کا ہے۔ لفظِ علم اور لفظِ عقل کی تحقیر حق ناشناسی ہے۔ صُوفیاء کرامؒ نے جس عقل کی مذمت فرمائی ہے وہ دنیاوی عقل ہے۔ لیکن غیبی اُمور کا علم حاصل کرنے والی عقل تو ایک اور عقل ہے۔ مدارِ کار عقل، فہم، شُعور، آ گہی اور بصیرت پر ہے۔ بصیرت کے معنی لُغت میں دِل کی بینائی کے ہیں۔ تقوٰی آئے اور بے عقلی اور بے علمی رہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟! ذکر و فکر بیمار عقل کو صحت مند بنانے کے لئے ہیں۔ صوفیاء کرامؒ کی گفتگو اور تصانیف میں بیمار عقل کی نفی کی گئی ہوتی ہے۔ تندرست عقل ہی عشق ہے، جبکہ آج کل جذباتیت کو عشق سمجھا جا رہا ہے۔ ہماری عقل نے کیا عشق کرنا! حسن کی پہچان کے لئے کوئی دیدۂ بینا چاہیے۔ حضرت شاہ اِسماعیلؒ نے بلند ترین صوفیاء کرام کو مُفہمین لکھا ہے۔

۸۔ محبوبِ ربّانی بننا انسان کا آخری نصب العین ہے۔قرآنِ کریم انسان کو محبوبِ ربّانی دیکھنا چاہتا ہے۔اور آپ ﷺ کا عکس جس کسی میں آجائے تو وہ محبوب ٹھہرایا جائے گا۔اس لئے عکس جذب کرنے کی جدوجہد کریں۔مُحِبّ اپنے محبوب کا عکس جس میں دیکھیں گے اسے اپنا محبوب بنالیں گے۔اس لئے تکمیلِ ایمانی اور محبوبِ ربّانی ایک عمل ہوا۔اور فاتّبعونی سب سے بہتر صحابہ کرامؓ نے کی۔اس لئے اگر بطرزِ صحابہ اطاعت کی جائے گی تو تب ہی اسے اطاعت کہا جائے گا، پھر اطاعت کرنے والے کا نام معشوقِ ربّانی ہو جائے گا۔انجذابِ رنگہائے رسول بطرزِ صحابہ! رنگ جذب کرنے یعنی متابعتِ رسول کے سات درجے ہیں:

۱۔عقائدواعمال کی درستگی اور اُن کو اختیار کرنا (یہ علمائے ظاہر کا درجہ ہے۔)

۲۔اصلاحِ نفس وقلب (مرشد کی رہنمائی یہاں سے شروع ہوتی ہے۔)

۳۔آپ ﷺ کے احوال کا انجذاب (ولائت یہاں سے شروع ہوتی ہے)

۴۔حروفِ مقطّعات کے بھید کھلنا اور مُتشابہاتِ قرآنی کا انکشاف (یہ علمائے راسخین کا درجہ ہے۔یہ خالص وہبی دولت ہے۔)

۵۔آپ ﷺ اور نبوّت سے سرفراز باقی انبیاء کرامؑ کو جنابِ حق تعالیٰ جو رزقِ باطنی کھلاتے پلاتے ہیں، انؑ کا پس خوردہ اس درجہ کے اولیاء کرامؒ کو کھلایا پلایا جاتا ہے۔(اس درجہ کے لوگ مجتبٰے ہیں۔)

۶۔دسترخوان تو آقا کے لئے ہو لیکن آقا اپنے غلاموں کو اپنے ہمراہ دسترخوان پر کھانا کھلائیں۔اس درجہ کے لوگوں کو انبیاء کرامؑ کے ساتھ بٹھا کر کھلایا پلایا جاتا ہے۔

۷۔آپ ﷺ کی غلامی اور اتباع کے ذریعے یہ مقام عطا کیا جاتا ہے کہ جنابِ حق تعالیٰ خود کھلاتے پلاتے ہیں۔وہی رزقِ باطنی جو انبیاء کرامؑ کو عطا کیا جاتا ہے وہ اس درجہ کے لوگوں کو بھی عطا ہوتا ہے۔

سنت سے مراد یہ سات درجے ہیں۔پہلے تین درجوں میں اعمال، کوشش اور سعی کا عمل دخل ہے یعنی پہلے تین درجے کسب سے حاصل کئے جاسکتے ہیں اور آخری چار درجے وہبی ہیں۔بس جنابِ حق تعالیٰ کی مرضی کہ جس کو چاہیں منتخب فرمائیں۔

۹۔ تربیتِ قلب ہی طریقت ہے اور جب تربیتِ قلب ہو جاتی ہے تو پھر ہی قلب پر روحانی انکشافات ہوتے ہیں۔

۱۰۔ مؤرّخ، موسیقار، سائنسدان اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلتے اور خلوت میں اپنے کام میں لگے رہتے ہیں لیکن معترضینِ تصوف اُن پر رہبانیت کا الزام کیوں نہیں لگاتے؟ کوئی بھی تخلیقی کام creative solitude کے بغیر ممکن نہیں۔ یہی اصول دینی اور روحانی کاموں پر لگا لیں یعنی creative solitude۔ اسلام میں حِرا ایت ہے یعنی خلوت بحق۔ آیتِ مبارکہ ہے کہ ففِرُّوِا الی اللہ ۔ پس فرار اختیار کرو اپنے اللہ کی طرف! اور ہر خلوت کے معنی لذتوں سے خوفزدہ ہو کے بھاگنا کہاں ہے؟ سائنسدان laboratory میں خلوت گزیں ہو کر ہی تخلیقی کام سرانجام دیتے ہیں۔ اولیاء کرامؒ بھی خلوت نشینی میں معاشرے اور انسانیت کی فلاح کا کام کرتے ہیں۔ ڈاکٹر علامہ اقبال صاحب کا شعر ہے کہ

مصطفٰی اندر حرا خلوت گزیں
قوم و آئین و حکومت آفریں

رہبانیت تو یہ ہے کہ قوت حاصل کر کے اسے apply نہ کیا جائے، لیکن قوت حاصل کر کے اس سے کام لینا اور چیز ہے۔ غارِ حرا پہلے ہے اور پھر دارِ ارقم یعنی مکالمۂ حق سے سرفرازی کے بعد انسانیت کی حقیقی فلاح کا کام بھی کرنا ہے۔ حقیقت تو یہی ہے کہ creative کام ہمیشہ detachment سے اور solitude میں ہوتے ہیں۔ Creative detachment and solitude سے پھر attachment کا کام ہوتا ہے۔

۱۱۔ دینی علوم تقویٰ کے بغیر کوئی مفہوم نہیں رکھتے۔

۱۲۔ اسلام میں باطنی فتوحات مقدم ہیں۔ ظاہری فتوحات تب حاصل ہوں گی جب

باطنی فتوحات حاصل ہوچکی ہوں گی۔ اگر ظاہری فتوحات پہلے حاصل ہوگئیں تو یہ جان لینا چاہیے کہ یا تو وہ آزمائش ہیں یا سزا۔ حیاتِ رسول سے یہ رہنمائی حاصل ہوتی ہے کہ معراج پہلے ہے اور دنیاوی فتوحات کا سلسلہ بعداز معراج۔

۱۳۔ رحمانیت ایک بڑا دائرہ ہے اور اس دائرے کے اندر ایک چھوٹا دائرہ ہے رحیمیت کا۔ اللہ کریم کی صفتِ رحیمیت مخصوص ہے مؤمنین اور مسلمین کے لئے لیکن رحمانیت میں گنہگار، پارسا، کافر، مسلم کسی کا فرق نہیں ہے۔ اُن کی صفتِ رحمانیت ہر ایک کے لئے ہے۔

۱۴۔ دنیا اور آخرت کا رشتہ ہم نے کچھ اس طرح کا سمجھ رکھا ہے جیسے پاکستان اور انڈیا کا رشتہ یعنی دونوں ہمہ وقت متصادم ہیں۔ آپ ﷺ وہ معلّمِ عظیم ہیں کہ جنہیں اوّلین و آخرین کے علوم عطا فرمائے گئے۔ آپ ﷺ نے ہر فکری و عملی غلطی کی اصلاح فرمائی۔ دنیا کے مذہبی اور غیر مذہبی حلقوں نے یہ غلط فہمی پھیلا دی تھی کہ دنیا لینی ہے تو آخرت چھوڑنا پڑے گی اور اگر آخرت لینی ہے تو دنیا چھوڑنا پڑے گی۔ آپ ﷺ نے یہ غلط فہمی دور فرمائی۔ بس یہ سمجھنا ہے کہ دنیا جتنی جیسی ہے، اسے اتنا ویسا ہی سمجھا جائے۔ دنیا نہ پُوجنے کی چیز ہے اور نہ چھوڑنے کی۔ برتنے کی چیز ہے سو اسے برتا جائے۔ سوچ اور فکر کا زاویہ درست ہو تو جبلّی کام بھی دینی کام بن جاتے ہیں۔ کافر اور مسلم کے اٹھانوے فیصد کام صورتاً تو ایک جیسے ہیں لیکن محرکِ عمل دونوں کے یکسر مختلف ہیں اور محرکِ عمل بدل جانے سے کارِ دنیا کارِ آخرت بن جاتا ہے۔ عقل اور عمل کی درستگی ہی نیت کا درست ہو جانا ہے۔ بس یہ سوچ آدمی کے اندر پک جائے کہ مجھ سے اللہ تعالیٰ خوش ہو جائیں۔ اس سوچ اور فکر سے جو کام کیا جائے گا اسے اسلامی کام کہتے ہیں۔

۱۵۔ معراج ایک سفر تھا جس میں کچھ دَر کھلے تھے۔ نماز کو مومن کی معراج کہا گیا ہے تو اگر اب نماز میں دَر نہیں کھلتے تو کیا وہ نماز ہے؟!

۱۶۔ Subject to Err ہونا تو انسان کی حقیقت ہے تو پھر اسے اللہ کریم سے کیا چھپانا! بلکہ اسے چھپانا ہی گناہ ہے۔ حقیقتِ آدم مغفرت طلبی ہے اور مغفرت نوازی حقیقتِ ربّانی۔ حقیقتِ توبہ منکشف ہوئے بغیر کام کے آغاز کا سوال ہی نہیں کیونکہ پہلا مقام مقامِ توبہ ہے اور پہلا مقام آئے بغیر دوسرے مقام کی باری نہیں آتی۔ چشتیوں کا تو سب کچھ اضطرابِ باطن اور عشق ہے۔ جنابِ حق تعالیٰ بس ایک دیوانگی عطا فرما دیں۔ بظاہر دنیا اور خود کو ہوش مندی دکھائی دے لیکن ہو 'لبِ خنداں، دلِ گریاں'۔ زاہد کی تسبیح کی کھٹ کھٹ بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک مقام رکھتی ہے لیکن آہِ رنداں کا اور ہی مقام ہے!

۱۷۔ صوفیاء کرامؒ کا قول ہے کہ وجودِكَ ذنب یعنی تیرا 'تو' ہونا' ہی گناہ ہے۔ جس دنیا میں انبیاء کرامؑ اور اولیاء کرامؒ رہے ہیں اسی میں ہم رہ رہے ہیں! اللہ کریم ایسی ندامت نصیب فرمائیں۔ اس وقت بھی کیسے کیسے اتقیاء، صُلحاء اور اخیار موجود ہیں اور ہم بھی موجود ہیں۔ ہم تو ایسے ہیں جیسے کوئی بیل اولیاء کرامؒ کی محفل میں چلا جائے۔

۱۸۔ ہم حنفی jurisprudence پر چلنے کے قائل ہیں لیکن یہ رائے نہیں رکھتے کہ فقہ کی بات عین سنّت ہے اور عین قرآنِ کریم ہے۔ اسی بات پر جناب سیّد سلیمان ندویؒ اور جناب ڈاکٹر غلام محمدؒ تھے اور میں بھی اِسی بات پہ ہوں۔ آیات و احادیث اور چیز ہیں اور اخذِ نتائج اور چیز۔

۱۹۔ ایک بار استغفار پڑھ کے اگر تسلی نہیں ہوئی کہ جنابِ حق تعالیٰ مغفرت نوازی فرمائیں گے تو ہزار بار سے بھی نہیں ہوگی کیونکہ یہ تو ان کی مغفرت نوازی پہ شک ہوا۔ کسی شریف آدمی سے ایک بار معافی مانگی جائے تو وہ معاف کر دیتا ہے، اللہ کریم تو پھر الغافر، الغفورُ، الغفّار، الستّار، الکریم ہیں، اور ہر صفت میں وہ مطلق ہیں یعنی وہی تو ہیں جو معاف اور پردہ پوشی فرمانے والے ہیں اور کون؟! ان کی مغفرت نوازی کا کوئی حد کنارا نہیں اور نہ ہی کوئی شرط یا قید ہے۔ بس اپنا

ہِمّا نا پن لئے ان کے دربارِ اقدس میں پیش ہو جائیں۔

رحمتِ حق ’بہا‘ نہ می جُو ید

رحمتِ حق ’بہانہ‘ می جُو ید

وہ تو فرماتے ہیں کہ تم ایک قدم بڑھو میں دس قدم بڑھوں گا اور قرآنِ کریم میں فرمائے ہیں کہ لا یصلٰھا الا الاشقٰی الذی کذّب وتولیٰ۔ ایسا غرقِ معصیت تو ایک بھی نہیں۔ اب نارِ جہنم سے رہائی کی دستاویز تو مل چکی۔ کچھ فقیہہُ النفس حضرات یہ سوال کریں گے کہ پھر سزا کیا ہوئی؟ بھئی اس دنیا میں جو دکھ مصائب جھیل رہے ہیں، جسم اور ذہن کی مصیبتوں سے گذر رہے ہیں تو یہ اب شرّ ایرہ ٔ ہو گیا۔ جو ہمنشینی ہمیں حاصل ہے یہ ایمان کی نشانیوں میں کی ایک نشانی ہے۔ حضور نظامُ الدین اولیاءؒ کی روحانی اولاد میں نام لکھا گیا ہے یہ کلمہ گو ہونے کے بعد ایک نعمتِ عظمیٰ حاصل ہوئی۔ موجودہ دور میں بشارتوں کی طرف توجّہ بہت کم ہے جبکہ کام بشارت اور مغفرت کے اصول ہی سے چلتا ہے۔ ویسے شریف آدمی بشارتوں سے اور زیادہ شرمندہ ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو عظیم گنہگار سمجھنے کا غرور ترک کر دیں۔ آپ کے گناہ کیا اللہ کریم کی رحمت سے بڑھ گئے ہیں!

۲۰۔ جگہیں اور اوقات اپنے اندر ایک معنویت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے شہرِ مکّہ کی قسم کھائی ہے اور یہ قسم مکینِ مکہ یعنی جنابِ رسولِ کریم ﷺ کی وجہ سے کھائی۔ اسی سے یہ حقیقت سمجھیں کہ مکینِ مکّہ کا کیا عالَم ہوگا! انجیر کی بھی قسم کھائی یعنی انجیروں کے علاقے کی جہاں انبیاء کرامؑ تشریف لائے۔ پھر فرمایا کہ ہم نے انسان کو ظاہری باطنی بلند ترین چوٹیوں پہ رکھ کر پیدا کیا۔ جہاں اس بات کا ذکر فرمایا ہے اُس سے پہلے انبیاء کرامؑ کا ذکر ہے یعنی انبیاء کرامؑ کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ہیں وہ انسانِ کامل کہ جنہیں عظمت وکمال سے نوازا۔ سورۂ مبارکہ میں چار قسمیں کھا کر فرمایا کہ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم اور اسی آیتِ مبارکہ کا دوسرا ٹکڑا ہے کہ ثمّ رددنٰہ اسفلَ سافلین۔ اب سارے مولوی حضرات صرف پہلی stage یعنی احسن تقویم کی بات کرتے ہیں اور دوسرے حصے کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ جب تخلیقِ روح ہوئی تھی تو ایک بلندی حاصل

تھی لیکن اب تو اسفل سافلین ہے۔اب جو انسان hitch hiking کرے گا دوبارہ وہ بلندی حاصل کرلے گا یعنی اٰمنوا وعملوالصلحٰت کا سچا اور پکا نمونہ ہو اور اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لے جیسے کوہ پیما رسّی کو تھامے رکھتے ہیں۔اگر کبھی پھسل بھی جائیں تو دوبارہ تھام لیتے ہیں۔انسان اپنی گم شدہ بلندی کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔کُل بات تو فقط یہی ہے۔پھر تواصوا بالحق اور تواصوا باالصبر بھی ہے۔اور کوہ پیما اپنے گرنے والے ساتھیوں کو بھی سنبھالتے ہیں۔

۲۱۔ میری آخری گہری روحانی بات اگر کوئی ہے آگے پہنچائی جانے والی تو وہ یہ ہے کہ ایک Eternal Now-ness ہے،اور جمیلِ مطلق کا سامنا!!

بمستاں وعدۂ محشر حرام است

۲۲۔ احسن تقویم اور فی الارض خلیفہ اصل میں انبیاء کرامؑ ہیں۔ پھر کوئی جتنا جیسا انبیاء کرامؑ کا متبع ہو، اتنا ویسا وہ احسن تقویم اور فی الارض خلیفہ ہوتا ہے۔اصل کی جتنی باتیں کسی میں ہوں وہ اتنا ہی اصل کا نمائندہ یا خلیفہ ہوتا ہے۔جو نبوی احوال وافکار واعمال کا وارث ہو گا، اسے ہی خلیفہ مقرر کیا جائے گا۔اور جو انبیاء کرامؑ کے علوم واعمال کو اپنی ذات و وجود کا حصہ نہیں بنائے ہوئے تو وہ احسنِ تقویم اور خلیفہ بھی ہرگز نہیں۔خلیفہ اور احسنِ تقویم بننے کی potentiality ہر ایک میں ہے لیکن اہم بات تو اسے actualize کرنے کی ہے۔بیج کی آبیاری کی جائے گی تو اُس پر لفظِ درخت آئے گا ورنہ نہیں۔عین اسی طرح انسان کا لفظ بھی صرف اس پر لگے گا جو انسان بن جانے کی potentiality کو actualize کرے گا۔

۲۳۔ دین، مذہب صرف وہی ہے جو جنابِ رسولِ کریم ﷺ سے صحابہ کرامؓ کی ذات وحیات میں جاری وساری ہوا، اور پھر صحابہ کرامؓ سے ہم تک پہنچا۔اس لئے اطاعتِ رسول بطرزِ صحابہ ہے اصل چیز۔اپنی ذاتی رائے سے نہیں چلنا بلکہ صحابہ کرامؓ کے پیچھے پیچھے چلنا ہے۔اکیلے کوئی

بھی نہیں چلا، ہاں مگر پیچھے چلنے والوں میں سے کچھ آگے بڑھے ہیں لیکن آغاز میں تو پیچھے ہی چلے ہیں۔اور جو قدم بقدم چلے ہیں وہ تو کاملین ہیں۔آپ ﷺ کے نقوشِ پا سے جو ایک لکیر بنی ہے اسی لکیر کا نام ہے صراطِ مستقیم! حضور سائیں توکّلؒ صاحب نے خواب دیکھا کہ آپ ﷺ تشریف لئے جا رہے ہیں اور مولانا حضرت قاسم نانوتویؒ ان ﷺ کے عین پیچھے پاؤں پہ پاؤں رکھے جا رہے ہیں۔صبح حضرتؒ نے اپنے مریدوں کو بتایا کہ حضرت نانوتویؒ وہ آدمی ہیں جو عین متّبع سنّت ہیں۔

۲۴۔ ایک ہے نشرِ فیض اور ایک ہے جذبِ فیض۔ یہ جن کا کام ہے انہی کا کام ہے اور یہی خدا کی سنَّتِ جاریہ ہے۔شیخ کو مُشیخت اور مُرید کو مریدیَّت عطا فرماتے ہیں اور یہ اللہ کو معلوم ہے کہ کس کو کس سے کیا حاصل ہونا ہے، اور حاصل ہونا بھی ہے یا نہیں ہونا ہے۔محدِّث، فُقہاء اور صوفیاء کا جو کچھ بھی ہے وہ طفیلی کی حیثیّت سے ہے۔ یہ نبی ﷺ کے وارث ہیں۔اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جنابِ حق تعالیٰ کسی کو دوست کی حیثیت عطا فرما دیں اور وہ دوست کسی اور کو دوست کی حیثیت عطا فرما دے اور یوں دوستیوں کی زنجیر ہو جائے، یہ دین کا قصہ ہے۔ دوستیوں کی زنجیر میں ایک کڑی بننا ہی ولی ہونا ہوتا ہے۔اس زنجیر کی ہر کڑی کے ذرّے ذرّے میں پہلی کڑی کی حرارت آتی ہے۔شیخ محدَّب عدسہ ہوتا ہے اور یہ سلسلہ جنابِ سیّدنا علیؓ تک جاتا ہے۔ اِدھر والے کنارے پر مُرید ہوتا ہے۔دور بینوں سے دور بینیں جڑی ہوئی ہیں اور یوں یہ رشتہ آپ ﷺ تک جڑا ہوا ہے اور پھر جنابِ حق تعالیٰ ہیں۔سارا دین تو قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ میں ہے۔قرآن عین صاحبِ قرآن ﷺ ہے اور صاحبِ قرآن ﷺ عین قرآن۔

جھیل سے پانی دریاؤں میں جاتا ہے، اور دریاؤں سے نہریں اور ذیلی نہریں نکلتی ہیں۔ پھر ان نہروں سے water channels اور پھر کسی پائپ کے ذریعے باغوں تک پانی پہنچتا ہے۔اب بندہ تو یہ کہتا ہے کہ پانی کھالے سے آ رہا ہے، ویسے پانی تو جہاں سے آ رہا ہے وہیں سے آ رہا ہے۔اسی طرح فیضان کا بھی مُعاملہ ہے اور قیامت تک رہے گا۔ جبروت ملکوت کے عکس لہراتے ہیں قلبِ رسول میں، پھول کھلتے ہیں تو خوشبوؤں کا سفر چلتا ہے۔ یہ کام لفظ اور عمل دونوں سے ہوا ہے اور ان دونوں سے

ماوراءِ قلب کی قلبیّت سے بھی ہوا ہے۔

۲۵۔ حمد اور شکر دو چیزیں ہیں۔حمد کے بغیر شکر آنہیں سکتا اور اصل چیز تو حمد ہی ہے۔ جس کی بھی تعریف کی جائے دراصل جنابِ حق تعالیٰ ہی کی تعریف ہے۔شعر کی تعریف دراصل شاعر کی تعریف ہوتی ہے۔اسی طرح مخلوق کی تعریف بھی خالق ہی کی تعریف ہے۔حمد اصل ہے اسی لئے قرآنِ کریم شروع ہی الحمدُ للّٰہِ ربِّ العالَمین سے ہوتا ہے۔

۲۶۔ قرآن وحدیث کا موضوع فنِ ہدایت ہے۔ساری کی ساری احادیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ عقائد واعمال کے خراب ہونے کے نتائج کیا ہوتے ہیں یعنی ہماری اصلاح کے علوم بتائے گئے ہیں قرآن واحادیث میں۔فنِ ہدایت کے پانچ ابواب ہیں:

۱)عقائد ۲)عبادات ۳)معاملات

۴)معاشرت ۵)اخلاق

انہی ابواب کے متعلق تمام آیات اور احادیث ہیں۔تصحیحِ عقائد کے بغیر باقی چار ممکن نہیں اور عقائد کی تصحیح میں سب سے پہلے توحید ہے، باقی چار حقیقتِ توحید کے حصول کے ذرائع ہیں۔قرآن کا موضوع فیہ ذکرکم ہے۔توحید، نبوّت اور آخرت۔ یہ تینوں فیہ ذکرکم ہیں۔آدمی کا سنورنا بگڑنا، دنیا وآخرت میں آدمی کی ذلت عزت، یعنی کن علوم واعمال سے بات سنورتی ہے اور کن سے بگڑتی ہے قرآنِ کریم میں یہ واضح کیا گیا ہے۔

۲۷۔ پہلے غارِ حرا، دارِ ارقم اور کوہِ صفا ہے اور پھر مکی زندگی۔ پھر ہجرت، میثاقِ مدینہ، مؤاخات اور غزوات۔ اِن کے بعد فتوحات کا سلسلہ ہے۔ دل بدلنے سے دنیا بدلتی ہے، دنیا بدلنے سے دل نہیں بدلتے!

۲۸۔ میں نے جب لکھنا سیکھا تھا

پہلے تیرا نام لکھا تھا

بس یہی مولا طلبی ہے۔ ہمارا نصبُ العین دنیا و آخرت میں بس یہی: مولا طلبی! مولا طلبی ہے تو اس لئے رسول طلبی بھی ہے۔ رسول طلبی ہو گی تو شیخ طلبی بھی ہو گی۔ تو شیخ طلبی عین خدا کی طلب ہی ہے۔ پیالی ڈھونڈھ رہا ہوں اور اس دوران اگر چائے کا نام نہیں لے رہا لیکن یہ تو معلوم ہی ہے کی چائے ہی پینی ہے۔ پہلے جلی حروف میں مولا طلبی لکھ لیں کہ باقی سب کچھ اس میں گم ہو جائے۔ مولا اگر مولا ہے تو سب کچھ اس میں گم ہے اور گم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دکھائی نہیں دیتی بلکہ مولا میں کھپ جاتی ہیں۔

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق

شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

کسی مقدس دربار میں جائیں تو دونوں جوتیاں اتار کر ہی داخل ہو سکتے ہیں۔ اگر بارگاہِ حق میں جانا ہے تو دنیا و آخرت دونوں جوتیوں کو اتار کر جانا ہو گا۔

۲۹۔ سگِ دنیا تو نہیں بننا اور نہ ہی رہبانیت اختیار کرنی ہے، بلکہ ربّانیت اختیار کرنی ہے، یعنی خلوت بحق۔

۳۰۔ حقیقتِ دنیا جان سمجھ کر آخرت کا کام کریں گے تو مستقل مزاجی اور لگن سے کام کر پائیں گے۔ آخرت تو جب آئے گی تب ہی آئے گی لیکن کارِ آخرت تو اب ہے۔ تصورِ آخرت سے جو present tense اب نکل گیا ہے اس سے بہت سی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ حدیثِ مبارکہ تو یہ ہے کہ الدُّنیا مزرعۃُ الآخرہ۔

۳۱۔ عشق الٰہی کی آگ کسی طرح انسان کے اندر بھڑک جائے پھر وہ سب کام کر

دیتی ہے۔ حضرتِ والاؒ فرماتے تھے کہ چشتیوں کے ہاں تو محبت ہی سب کچھ ہے۔ یہی دریا، یہی کشتی اور یہی چپو۔ جو ڈوب گیا وہ بھی بامراد اور جو کنارے لگا وہ بھی کامران۔ کائنات تعینِ حُبی ہے یعنی اپنے آپ سے اللہ کی محبت کا expression ہے، اس لئے سیرِ سُلوک بھی محبت سے ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ یحبُّھم و یحبُّونہ۔ اگر عشق ہے تو پھر خوفِ ملامت کیسا! فراق صاحب کا شعر ہے کہ

مفت بدنام ہوا نام بھی بدنامی کا
ہو سکا کوئی ترے عشق میں رُسوا بھی کہاں

اپنی یا کسی اور کی طرف نگاہ ہونے کا مفہوم ہے کہ جنابِ حق تعالیٰ کی طرف نگاہ نہیں ہے۔ بس زاویۂ نگاہ ہے سب کچھ اور درست زاویۂ نگاہ کو ولائت کہتے ہیں۔

گرچہ بدنامیست نزدِ عاقلاں
ما نہ می خواہیم ننگ و نام را

نبیوں پہ سب سے زیادہ مصائب و آلام آئے ہیں، اب جو کوئی بھی اُن کی راہ پہ چلے گا اُسے بھی وہ مصائب و آلام پیش آئیں گے۔ جس درجہ کا اتباع ہوگا اسی درجے کے حالات پیش آئیں گے۔

یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سرِ روسیاہی لکھی گئ
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سرِ بزمِ یار چلے گئے

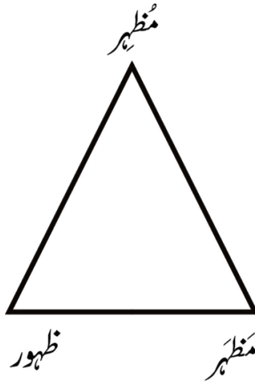
۳۲۔ لطائفِ ستّہ آدمی کے سینے میں antenas کی مانند ہیں جو انوار و تجلّیاتِ ربّانی کو receive کرتے ہیں۔ ویسے یہ لطائف cosmos کے اندر کی چیز نہیں، بلکہ اِن کا مقام عرش کے اُس طرف ہے جہاں حقائقِ غیبیہ ہیں۔ ہمارا قلب عرش کے اُس طرف والے قلب کی لہریں receive کرنے کا آلہ ہے۔

۳۳۔ مقصدِ تخلیق عرفانِ حق ہے۔ جنابِ حق تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں فرمایا کہ ما

خلقتُ الجنہ والاِنس الا لیعبدون اور الا لیعبدون کے معنی ہیں الا لیعرفون!
انسان کی تخلیق کا مقصد فقط یہ ہے کہ وہ اپنے خالق کا ہو جائے اور معرفتِ حق کے حصول کے لئے اپنی جان لڑا دے۔ تخلیقِ کائنات کا اصول محبت ہے۔ جنابِ حق تعالیٰ نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں۔

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں

تخلیق کی حقیقت مظہریت ہے۔ سب جنابِ حق تعالیٰ کے اسماء وصفات کے کرشمے ہیں۔ لیکن ظاہر ہو کے بھی وہ ھوالباطن ہی ہیں۔ اول الخلق اور مظہرِ اتم فقط آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس ہے! آپ ﷺ خدا کی ذات اور اسماء وصفات کا آئینہ ہیں اور باقی سب کچھ آپ ﷺ کا مظہر یعنی ایک direct مظہر ہے جنابِ حق تعالیٰ کا اور ایک indirect۔ آپ ﷺ وجہِ وُجودِ کائنات ہیں۔ حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ تخلیق مظہریت ہے۔ اور اس مظہریت کو سمجھنے کے لئے مثلث کو سمجھنا پڑے گا۔



غیرِ حق سب خلق ہے یعنی اسماء وصفات کے ظہورات ہیں جنہیں تجلیات کہا جاتا ہے۔ یہ تجلیات مسلسل ہیں اور ان میں تکرار نہیں۔ آئینہ گر آئینے بنا کر ان آئینوں میں ظاہر ہوا۔ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ ذاتِ حق ذاتِ خلق کا آئینہ اور ذاتِ خلق ذاتِ حق کا آئینہ۔ وحدتُ الوُجود والوں کا حال شدید ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں جنابِ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ فاینما تولوا فثمَ وجہُ اللہ جب وحدتُ الوجود درجۂ حال کو پہنچتی ہے تو پھر اس آیتِ مبارکہ کی سمجھ آتی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے فرمایا کہ

درجۂ حال ذکر مُراقبہ اور صحبتِ شیخ سے میسر آتا ہے۔ اربابِ باطن سے مراد ہے صاحبِ مشاہدہ لوگ۔ انسانی وجود ایک machine کی مانند ہے اور اس میں production کا لفظ تو آئے گا اگر اس سے کام لیا جائے۔ اور اگر working نہیں تو کچھ نہیں۔ ذکر کا مقصد نام سے بھی نہیں بلکہ اُس ذات یعنی نام والے سے ہے۔ دھیان کی آنکھ کے سامنے بس ذات ہی ذات رہے اور غیرِ ذات سے مکمل نسیان ہو جائے۔ مقامِ فنا حاصل ہونے کے بعد ہی انسان کا شمار اربابِ باطن میں ہوتا ہے اور مقامِ فنا مقاماتِ عشرہ طے کئے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔

۳۴۔ العجز عن درکُ الادراک ادراک ۔ ناسمجھی کی سمجھ کو سمجھ لینا ہی اصل سمجھ ہے یعنی جو کچھ سمجھا وہ اصل میں ناسمجھی ہے۔ اپنے نفی اثبات پر نفی پھیرتے جانا ہے۔ حقیقتِ خلق فقرِ محض کے سوا کچھ نہیں اور حقیقتِ حق غناءِ محض کے سوا کچھ نہیں۔ کیا ہے جو جنابِ حق کا نہیں! کیا ہے جو خلق کا ہے! جنابِ حق نہ ہوں، یہ کیسے ہوسکتا ہے، اور دوسرے نہ ہوں تو پھر کیا۔ جنابِ حق نے تو ہونا ہی ہونا ہے اور دوسرے سب کے ہونے یا نہ ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ جنابِ حق ہیں تو پھر کیا کیا نہیں ہوگا! لیکن دوسرے سب ان کے کئے سے ہیں، خود بخود تو فقط وہ ہیں۔ جنابِ حق کو مکمل اختیار ہے کہ وہ کسی اور کو موجود کریں یا نہ کریں۔ اگر موجود کر بھی دیا تو بھی ہر موجودی موجود رہے جانے میں ہر لحہ مکمل محتاج۔ قرآنِ کریم میں جنابِ حق تعالیٰ فرمائے ہیں کہ وانتم الفقراء الاالله جب تک اپنا فقیرِ محض ہونا نہیں کھلتا تب تک معرفت کی پرچھائیں بھی حاصل نہیں ہوسکتی۔ جس نے اپنے بے قیام ہونے کو پہچانا اسی نے جنابِ حق کے قیّوم ہونے کو پہچانا۔ خالق کے خالق ہونے کی وجہ سے مخلوق کا ہونا ہے، مخلوق کے ہونے سے خالق کا ہونا نہیں۔ جب وہ علیمِ مطلق ہیں تو پھر موجودات کیوں نہ ہوں! چیزیں اپنے ہونے میں جتنی محتاج درمحتاج ہیں، ہو کر رہے جانے میں بھی اتنی ہی محتاج درمحتاج ہیں۔ دونوں حالتوں میں آخری درجے کا احتیاج ہے۔ اس احتیاج کو آدمی جانے سمجھے، اسی سمجھ کو معرفتِ ذات اور الا لیعبدون کہتے ہیں۔

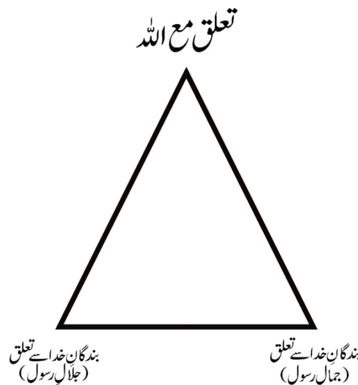
۳۵۔ ارکانِ اسلام چار ہیں۔ کسی فقیہہ نے جہاد کو ارکانِ اسلام میں تحریر نہیں کیا کیونکہ ارکانِ اسلام میں صرف اس عبادت کو شامل کیا جو ہر عہد، ہر وقت اور ہر ایک سے ہو سکے۔ اس بات کا علم فقط قرآن وحدیث پڑھ کر تو ہو نہیں سکتا تھا۔ یہ تو فقہاء کرامؒ نے اخذِ نتائج کیا ہے۔ امّت کے اصل محسن تو فقہاء کرامؒ اور صوفیاء کرامؒ ہیں، باقی تمام تو انؒ کی باتوں کو اکٹھا کرنے والے ہیں۔ تصوف میں باطنی اعمال کی اور فقہ میں ظاہری اعمال کی بحث ہے اور انسان ظاہر و باطن کا مجموعہ ہے۔ کسی ایک کو بھی نظر انداز کیا جائے گا تو انسان کی totality مجروح ہو کے رہے گی۔ لیکن باطن کو ظاہر پر فوقیت حاصل ہے۔ جہاد کرتے وقت بھی اگر قلب میں حرص، حسد اور کبر ہے، تو اس جہاد کا کیا بنے گا؟! جہاد بھی کر رہے ہیں، اور حبِّ جاہ بھی ہے سینہ میں، تو انّما الاعمالُ باالنیّات کا کیا ہوگا؟! تزکیۂ قلب کے بغیر جب جہاد کیا جائے گا تو بھلا نتائج کیسے نکل سکتے ہیں۔ آج کل اسی وجہ سے جہاد کے نتائج نہیں نکل رہے۔

۳۶۔ جوہرِ آدم کی crystalization کا نام ہے تصوف۔ ساری قابلیتوں کو یکسوئی میں سرگرمِ سفر کرنا اور سفر کی سمت خدا کے خدا ہونے کی سمت ہو۔ انسان کی ساری صلاحیتوں کو واحد نصب العین کے لئے بروئے کار لانا تصوف ہے۔ صرف اخلاقیات کا نام تصوف نہیں یعنی رذائل فضائل تک بات محدود نہیں بلکہ منزل ان سے کہیں آگے ہے۔

A creative relationship between God as such and man as such is tasawuf. Totality of man's strife to live God, to live in God and to live through God is the ultimate target of tasawuf.

یہ بات place to place and time to time بدلتی رہتی ہے لیکن مقصد فقط یہی رہا کہ میں خدا کا ہو جاؤں اور خدا میرا ہو جائے۔ جب ظاہری اور باطنی دونوں سطحوں پر ایسا ہو جاتا ہے تو پھر ہی انسانی ذات کے سارے امکانوں کا صحیح اظہار ممکن ہوتا ہے۔ آدمی کا خدا سے اور خدا کا آدمی سے

تعلق! اللہ کا بندے سے تو تعلق ہی تعلق ہے لیکن سوال تو ہے بندے کا اللہ سے کتنا سچا اور پورا تعلق ہے۔ بندے کا اپنے خالق و مالک سے تعلق استوار ہو جائے اور پھر بات اس سے آگے عشق تک بھی تو جائے ناں۔ میں تو اللہ کا عاشق بن گیا لیکن کیا اللہ تعالیٰ مجھ سے راضی بھی ہیں یا نہیں؟ اصل چیز تو اُن کا راضی ہو جانا ہے۔ ذکر اذکار جتنے مرضی ہو جائیں لیکن سوال تو پھر بھی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے اذکار و اشغال کو کیا سمجھتے ہیں۔ وہ اگر کسی کے ایک آنسو کو سب کچھ سمجھ لیں اور کسی کی دس سال کی ریاضت کو کچھ نہ سمجھیں تو ان پر کسی کا زور نہیں۔ انسانی وجود اُس فیصلے کی تلاش میں دیوانہ وار اپنے اللہ کی طرف بھاگے یعنی میرے اللہ مجھے کیا سمجھتے ہیں کیونکہ فیصلہ نہ عبادت سے اور نہ ہی اپنی عاشقی سے ہوگا، فیصلہ تو جنابِ الواحد کی رضا سے ہوگا۔ فیصلہ خدا کا چلے گا یعنی نگاہِ ربانی میں کون کیا ہے۔ اِسی فکر کا نام تصوف ہے۔ نگاہِ ربانی اور نگاہِ انسانی کے مقامِ اتصال کی بات ہے۔ جوہرِ انسانی کا تزکیہ، تصفیہ اور تجلیہ! کارِ تصوف سے مراد یہ تین الفاظ ہیں۔ تزکیہ، تصفیہ اور تجلیہ یہی ہے کہ نگاہِ انسانی وہاں جا کے رکے جہاں نگاہِ ربانی متوجہ ہے۔ جنابِ حق تعالیٰ تو کمالِ انسانی آپ ﷺ کے ذات و وجود میں دیکھ رہے ہیں تو اب کمالِ انسانی تو کمالِ محمدی ہے۔ نگاہِ انسانی کا سوال نہیں کہ وہ کہاں رُکی ٹھہری بلکہ نگاہِ ربانی کا ہے اور نگاہِ ربانی تو آپ ﷺ کی طرف ہے۔ بندہ اور خدا کے درمیان رسولِ خدا ﷺ ہیں۔ بندگانِ خدا، رسولِ خدا ﷺ اور خدا۔ آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس کو اگر ایک تِکون سمجھا جائے تو بات آسانی سے سمجھ آ جائے گی۔



جمالِ رسول سے مراد ہے آپ ﷺ کی رحمت للعالمینی یعنی آپ ﷺ کا رؤف اور کریم ہونا۔ اور جلالِ رسول سے مراد ہے آپ ﷺ کا عزیز اور نذیر ہونا۔ امتِ اجابت یعنی مسلمین اور مؤمنین کے لئے آپ ﷺ کا جمال ہے اور امتِ دعوت یعنی غیروں اور کافروں کے لئے آپ ﷺ کا جلال۔ صفاتِ محمدی کا کُل خلاصہ جمال وجلال ہے۔ کسوٹی یعنی norm and criterion تو فقط آپ ﷺ کی ذات وحیات ہے چنانچہ نگاہِ انسانی بس آپ ﷺ کی طرف متوجہ ہو اور نگاہِ انسانی کی آپ ﷺ پر ٹکٹکی بندھ جانے کو کارِ سُلوک کہتے ہیں۔ تصوف نام ہے اپنے ظاہر و باطن میں محمدیت کی recreation کا۔ ہر آدمی کی ذات کا nucleus یہی ہے کہ اس کے اندر محمدیت کی recreation کی possibilities موجود ہیں، اُن possibilities کو actualise کرنے کو تصوف یا کارِ سلوک کہتے ہیں۔ آپ ﷺ کے ظاہری اور باطنی افکار و اعمال اور احوال کی rebirth اپنے وجود میں کرنے کی جدوجہد کرنی ہے۔ نگاہِ ربانی میں اعتبار صرف اُن اوصاف کا ہے جن میں آپ ﷺ کی اداؤں کا عکس اور خوشبو ہوگی۔

باب سوم

وحدتُ الوُجود

۱۔ قرآن وحدیث کا نچوڑ۔فقہ

فقہ کا نچوڑ۔تصوف

تصوف کا نچوڑ۔وحدتُ الوجود

۲۔ میرے شیخِ عالی مقامؒ نے فرمایا کہ 'صبا صاحب، ایک کو خواہ مخواہ دو کہنے کی کیا ضرورت!' یعنی وجود واحد ہے اور موجودات کثیر۔ ہر موجودی اور ہر سبب عینِ حق ہے۔ سبب عین مسبِّب ہے اور عبد عین معبود۔ حق تعالیٰ کی اوّلیت عین آخریّت ہے اور ان کی آخریّت عین اوّلیت۔ اُن کا ظہور عین بُطون ہے اور بُطون عین ظہور۔ ویسے اِن الفاظ کی بھی وہاں کیا مجال! تشبیہ (Immanance) عین تنزیہہ (Transcendence) ہے اور تنزیہہ عین تشبیہہ۔ حضرت شیخ عبدُ القدوس گنگوہیؒ فرمائے ہیں کہ

ہست قُدّوسی فقیری در فناء و در بقا

خودبخود آزاد بودی خود گرفتار آمدی

اس کو شریعت کی حدوں میں رکھنا ہے لیکن واردۂ قلب ہے تو اس سے کہاں تک بھاگنا ہے۔ وحدتُ الوُجود سے بھاگیں گے تو فیضان کا در بند ہو جائے گا۔ فیضان کے در کھلنے دو۔

پیکروں کے درمیاں رفتارِ لا پیکر بھی میں

پیکروں سے دور میں زندہ اسی پیکر میں ہوں

یہ شعر جب اپنے شیخ عالی مقامؒ کو سنایا تو حضرتؒ فرمائے کہ 'صبا صاحب، آپ تو پورے وجودی ہیں'۔ اتنی صورتوں میں بے صورتی جلوہ گر ہے، وہ تو ایسی تنزیہہ ہے۔ وہ ہزاروں بہروپ بھر کے بھی آ جائیں، پہچاننے والے پہچان لیتے ہیں۔

بہر رنگی کہ خواہی جامہ می پوش

باندازِ قدت را می شناسم

۳۔ اللہ جنابِ حق تعالیٰ کا اسمِ ذاتی ہے اور باقی اسماءِ مبارکہ اسی اسمِ ذاتی سے آتے ہیں۔ جب اللہ کہا تو سارے اسماءِ مبارکہ کہہ دیے۔ آپ ﷺ اسمِ ذاتی کا مظہر ہیں اور باقی تمام موجودات اسماءِ صفاتی کا مظہر ہیں۔ جنابِ حق تعالیٰ نے کسی پہ اسمِ رحمٰن کی تجلّی ڈالی اور کسی پہ اسمِ الھادی کی۔ یعنی ایک خاص اسم کو اُس آدمی کے وجود کا nucleus بنایا لیکن اللہ کے اللہ ہونے کا آئینہ صرف آپ ﷺ کو بنایا۔ اسی کا نام جامعیّت ہے۔ دوسری تمام موجودات کا nucleus تو بہرحال کوئی ایک اسم ہے۔ کوئی موجودی ایک سے زیادہ اسماء وصفات کا مظہر بھی ہوسکتی ہے لیکن شانِ جامعیت فقط آپ ﷺ کے وجودِ اطہر کو عطا ہوئی۔ ہر موجود کا ربّ وہ اسمِ خاص ہوتا ہے جس کا وہ مظہر ہے اور وہی اِسم اس کی پرورش کرتا ہے۔ کسی کی پرورش جس اسم سے ہو رہی ہو اس کا جان لینا نقشبندی سلسلے میں تکمیلِ سلوک ہے۔

جنابِ حق تعالیٰ نے اپنا عکس جس آئینے میں دیکھا، وہ تعیُّنِ محمدی ہے۔ صوفیاء کرامؒ اسی تعیُّن کو بُت لکھتے بولتے ہیں۔ اور اب صوفیاء کرامؒ کی شاعری اور انؒ کی اصطلاحات سے ناواقفیت کی بِنا پر کچھ لوگ انہیں بت پرست کہتے ہیں۔ لاتعیُّن کسی تعیُّن میں اور بے صورتی کسی صورت ہی میں جلوہ گر ہوگی، ورنہ لاتعیُّن کو کیسے دیکھیں؟!

پری پیکر، نگارِ، سرو قدّے، لالہ رخسارے

سراپا آفتِ دل بُود، شب جائیکہ من بُودم

۴۔ معصیت کو فقط معصیت ہی سمجھنا اصل گناہ ہے کیونکہ جنابِ حق تعالیٰ نے بے مقصد کچھ نہیں بنایا۔ جنابِ حق تعالیٰ تو فرمائے ہیں کہ ربّنا ما خلقتَ ھٰذا باطِلا معصیت بھی اللہ کی مخلوق ہے اور عبادت بھی اور مخلوق میں خالق کا جلوہ ہوتا ہے۔ کالا رنگ بھی اللہ نے بنایا ہے اور

سفید بھی اور بنانے کا کمال تو دونوں میں برابر ہے۔لیکن کالا کالا ہے اور سفید سفید! کافر کافر ہے اور مومن مومن! بہرحال مخلوق میں خالق ہی کا جلوہ ہوتا ہے۔ وہ خالق بھی ہیں اور مالک بھی، قدیر بھی ہیں اور علیم بھی، اور ان اسماءِ مبارکہ سے پہلے الف لام (ال) لگا ہوا ہے یعنی مطلق (Absolute)۔ جب وہی السمیع، البصیر، العلیم، الغافر ہیں، تو پھر دوسرا اور کون اور کیسے؟! جب ہر ہر صفت میں وہ مطلق ہیں تو دوسرا کوئی کیسے؟ سارے مولوی صاحبان مجھے یہ سمجھا دیں۔کہیں کچھ نہیں جنابِ حق تعالیٰ کے سِوا۔ یہ سب تو دھوکہ ہے فریبِ نظر ہے۔کئی آئے اور چلے گئے، اور وہ آئے ہی کب تھے، لائے گئے تھے۔ Other than God کوئی نہیں۔خارج میں ذاتِ حق کے سوا اور کچھ نہیں۔

شخص تو ایک ہی ہوتا ہے جبکہ عکس دو طرح کے ہوتے ہیں۔ایک سیدھا عکس اور ایک الٹا عکس۔لیکن صاحبِ عکس تو الٹا سیدھا نہیں ہوتا۔مسئلہ خیر و شر اسی سے سمجھیں۔گہرے اور شفاف پانی میں عکس سیدھا ہوتا ہے اور تھوڑے اور گدلے پانی میں اُلٹا۔تھوڑا پانی ہی گدلا ہوتا ہے زیادہ پانی کبھی گدلا نہیں ہوتا۔ گدلا پن کیا ہے؟ گناہ، برائی، معصیت۔ چلتے پانی کو کوئی ناپاک نہیں کہتا۔ولی دریائے کنہار ہوتا ہے اسی لئے ہر ایک کو گلے لگاتا ہے۔استغفار کرنے کے معنی پانی کو پاک کرنا نہیں بلکہ دریا میں نجاست پھیلانے کا جو خانہ ہے آدمی میں، اس خانے کو ٹھیک کرنا ہے۔ ہر انسان کے اندر خدا کا عکس ہے اور وہ عکس ہی دریائے کنہار ہے جو کبھی ناپاک نہیں ہوتا۔

سنا ہے حشر میں شانِ کرم بے تاب نکلے گی
لگا رکھا ہے سینے سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو

۵۔ وحدت الوُجود میں جب تک درجۂ حال نہ آئے تب تک درجۂ علم کام نہیں آتا۔اور ایک علم صاحبِ حال کو درجۂ حال کے بعد عطا ہوتا ہے، جب انسان کو وہ مقام حاصل ہو جاتا ہے تو وہ آدمی ابنِ عربیؒ، شاہ اسماعیلؒ، حاجی امداداللہؒ اور پیر مہر علی شاہؒ بن جاتا ہے۔

۶۔ غیر انسان خلائق میں جنابِ حق تعالیٰ کے اسماء وصفات کی تجلّیات ہیں لیکن ذات اور اسماء وصفات دونوں کا انکشاف فقط انسان میں ہے۔ من الرّوحی سے مراد انکشافِ ذاتِ حق ہے، لیکن یہ انکشافِ ذات ہے، خود ذات نہیں۔ انسان کے وجود میں جنابِ حق تعالیٰ نے آئینہ صفتی رکھی جس کے اندر عکسِ ذات کو ملاحظہ فرمایا اور اپنے اسماء وصفات کا عکس دوسری ساری چیزوں میں ملاحظہ فرمایا۔ آپ ﷺ کا اصولِ تخلیق جو متعین فرمایا گیا اُسے نورِ محمدی یا وحدت کہتے ہیں۔ خطِ وحدت میں احدیت کا انکشاف ہوا یعنی وحدت کے آئینہ میں جنابِ حق تعالیٰ نے اپنے جلوؤں کو دیکھا۔ احدیت کے انکشاف کو عقلِ اول، وحدت اور نورِ محمدی کہا جاتا ہے۔ پھر عکسِ وحدت کا انکشاف واحدیت میں ہوا ہے یعنی تمام خلائق (ملائکہ، اجناء، انسان اور غیر انسان) میں عکسِ وحدت ہے۔ اسی لئے یہ کہا جاتا ہے کہ ہر شے کو وجود نورِ محمدی سے ملا یعنی وحدت ہی آگے مختلف آئینوں میں جلوہ گر ہوئی۔ لیکن اس عکسِ وحدت میں صرف انسان کی روح میں انعکاسِ کامل ہے جبکہ باقی مخلوقات میں انعکاسِ وحدت کامل نہیں۔ اسی لئے انسان اشرف المخلوقات ہے۔ تخلیق کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ جنابِ حق تعالیٰ حلول کر گئے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نور سے تخلیق فرمایا، اس میں جاہل صوفیاء جزویت لگا لیتے ہیں۔ جبکہ یہ تجسُّم یا تجسیم کی بات ہی نہیں۔ نور سے تخلیق کئے جانے سے مراد نتیجہ خیزی اور اثر آفرینی ہے، ایسا ہرگز بھی نہیں کہ پہلی چیز دوسری کا جزو بن گئی ہے۔ پہلی چیز پہلی ہی ہے، اور دوسری چیز دوسری۔ پہلی دوسری نہیں، اور اسی طرح تیسری دوسری نہیں۔ اس تناظر میں اس بات کو دیکھیں سمجھیں کہ آپ ﷺ میں احدیت کا عکس، اور باقی تمام میں وحدت کا عکس ہے۔ جن معنوں میں سورج کی روشنی کسی دیوار کی روشنی بن جاتی ہے، لیکن یہ نہیں ہوتا کہ سورج اپنی جگہ سے ہل گیا یا سورج کے کچھ contents اس سے minus ہو گئے اور دیوار کا جزو بن گئے۔

خدا کا اپنے رسول ﷺ اور دوسری مخلوقات سے کوئی بڑھئی اور میز والا رشتہ نہیں، کیونکہ بڑھئی اور میز کا رشتہ تو ایک غیر متواتر تعلق ہے، بلکہ رشتے کی نوعیت جھیل میں سورج کے عکس کی سی ہے، اور سورج ڈوبتا بھی ہے۔ جھیل میں سورج کا جو عکس اترا ہوا ہے وہ عکس سورج کی طرف دیکھ کر سورج کو سورج کہے یا اپنی طرف دیکھ کر کہے کہ میں سورج ہوں، میں سورج ہوں، تو کیا غلط کہا اس نے! یہی انا الحق

ہے۔ایک اور مثال سے بات سمجھیں کہ دریا میں کشتی جا رہی ہو اور اس میں مسافر بھی ہوں، لیکن اصل حرکت تو آبِ رواں کی حرکت ہے۔ وہاں تو یہ حرکت حقیقی ہے لیکن کشتی جو متحرک نظر آ رہی ہے وہ دریا کے پانی کی حرکت کا اثر اور نتیجہ ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ پانی لکڑی نہیں ہو گیا اور لکڑی پانی نہیں بن گئی۔ کشتی کی حرکت پانی کی حرکت کا نتیجہ ہے، اور مسافروں کی حرکت کشتی کی حرکت کا اثر ہے۔ اب یہ تینوں ایک ہی ہیں لیکن پہلی حرکت ہی حقیقی ہے، باقی دو تو ہیں ہی نہیں۔ خدا، آدمی اور کائنات کے رشتے کو بھی اسی طرح سمجھ لیں۔

۷۔ موجودات جس کی تجلّیات ہیں، وہ تو وہی کے وہی ہیں۔ وہ تو الآن کما کان ہیں۔ لیکن جلوے نو بہ نو ہیں، اور نو بہ نو جلوے باطنی آنکھ والے کو ہی نظر آتے ہیں۔ عارِف کو ہر سجدہ میں نئے عجائبات ملتے ہیں۔

تھے کئی چہرے ترے چہرے کے اک اک نقش میں
تجھ کو تیرے حسن میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم

جمالیاتی شُعور جب لطیف ہو جاتا ہے تب ایسا ہوتا ہے۔ محوِیَت سے مسئلے حل ہوتے ہیں۔ آیتِ مبارکہ ہے کہ کلّ یوم ھُوَ فی شان۔ 'ھو' تو وہی ہیں جنابِ الواحد لیکن شیئون نو بہ نو ہیں۔ اور اُن کے جلوؤں میں تکرار نہیں لیکن جلوؤں میں گرفتار نہیں ہونا۔ اللہ کی تانگھ، محبت بھی خود اللہ تو نہیں ہے۔ ہمارا تصوّرِ الٰہ بھی خود اللہ نہیں۔ وہ ہر تصوّر، خیال، وجدان، کشف سے ماوراء ہیں۔ تصّور جتنا بھی ترقی کرتا جائے بس لا پھیرتے جانا ہے۔ حضرت بایزید بُسطامیؒ فرمائے ہیں کہ اقرارِ خداوندی کی آخری منزل انکارِ خداوندی ہے یعنی جو کچھ نظر آئے جو تصّور ابھرے، سبھی پہ لا پھیرتے جانا ہے۔ بس چلتے رہیں اور چلتے جائیں۔

ہمیں تو ہمسفر دن رات بس چلنے سے مقصد ہے
سفر محدود ہو جن کا انہیں ہو فکر منزل کی

۸۔ علامہ اقبال صاحب نے ارمغانِ حجاز میں فرمایا ہے کہ

دُرِ لاموجودالاّ اللہ دیاب

انسانی خودی تو لا موجودَ الاّ الله میں ملے گی۔ عالَم بس خیال ہی خیال میں ہے لیکن یہ جنابِ حق تعالیٰ کا خیال ہے، ہمارا خیال نہیں۔ لوگوں نے اس مقام پر ٹھوکر کھائی ہے۔ یہ زمان و مکان بھی خیالِ حق ہے۔ کچھ اور اگر مستقل خارجی ہوگا تو یہ double scheme ہو جائے گی اور ثنویّت آ کے رہے گی۔ ثنویت آئی تو توحید ہاتھ سے گئی۔ اسماء وصفاتِ حق اور لفظِ کُن کے کچھ تعلقات ہیں اور کُن تو خدا کا فعل ہے۔ ہمیں جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ بس حسّی وہمی ہے لیکن ہم اسے غیر حسّی نہیں کہہ رہے۔ اور جو ہماری حس ہے اسے بھی ہم اسماء وصفاتِ حق کا عکس کہہ رہے ہیں۔ خود اپنا وجود جب see through glass ہو جاتا ہے تو پھر اللہ ہی اللہ نظر آئے گا۔ اور اگر انسان کی حد تک ایسا ہو کہ انسان آنکھ ہو اور کائنات منظر اور جنابِ حق تعالیٰ اپنے اسماء وصفات سے منظر تخلیق فرماتے ہوں، تو بات کیا بنے گی! انسان کا status دوسری خلائق سے الگ ہے۔ الانسانُ الکامل آپ ﷺ ہیں۔ انسان کا شرف یہ ہے کہ اس میں کُلّیت کا انعکاس ہے۔ لیکن اللہ کے مقابل انسان نیست ہے، اور انسان کے مقابل کائنات نیست۔

۹۔ ہر سوچ یا بات سے پہلے لفظِ ہونیت اور نا ہونیت کو define کر لیں۔ ہونیت دو طرح کی ہے۔ ایک وہ کہ جس پر نا ہونے کا تصور ہی نہیں۔ وہ نہ ہو تو ایسا ہونے کا سوال ہی نہیں۔ ایسی ہونیت فقط ایک ذات کی ہے جسے اللہ کہتے ہیں۔ اُس کا ہونا ایسا ہے کہ نہ ہونے کا تصور ہی نہیں۔ اسے واجب ہونا کہتے ہیں یعنی جس کا اپنا ہونا بھی ذاتی، حقیقی، مستقل، مطلق، نا متناہی اور خود بخود اور اس کا جو کچھ ہے وہ بھی ذاتی، حقیقی، مستقل، مطلق، نا متناہی اور خود بخود۔ اللہ کے سوا دوسرا کوئی ایسا نہیں کہ جس کا ہونا واجب ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ الله واحد ہے۔ واحد الله اللہ ہے جو خود بخود ہے اور اس کی ساری صفات بھی ذاتی حقیقی مستقل اور قدیم ہیں۔ وُجوب، صمدیّت، غناء، ہمیشگی، یہ تمام لفظ صرف اور صرف خدا کی ذات کے لئے ہیں۔ صمد کا مطلب ہے کہ جس کی مشیّت کسی کا سہارا نہ پکڑے

اور دوسرے سارے اس کی مشیّت کا سہارا پکڑنے کے محتاج ہوں۔ خود بخود ہستی واحد ہے یعنی وہ جو کسی سے نہیں اور دوسرے سارے اگر ہوں گے تو اُسی سے ہوں گے۔ کوئی اور ہو نہ ہو، وہ تو ہوگا۔ وہ اگر کسی کا ہونا نہ چاہے تو کچھ ہوگا ہی نہیں۔ الٰہ واحد کے کرنے سے جس کی ہونیت ہو اُسے ممکن کہتے ہیں۔

نبی، ولی اور دوسری تمام خلائق 'ہونے' کی دوسری قسم کے ہو سکنے والے ہیں۔ ان میں ہونیت اور نا ہونیت دونوں باتیں برابر ہوتی ہیں۔ کر دیے گئے تو ہو گئے ورنہ ہو جانا واجب نہیں تھا۔ ہونا اور نہ ہونا ان میں مساوی ہے۔ یہ نہیں کہ ان کا ہو جانا واجب ہو بس موجود کر دیا تو موجود ہونا ہی تھا۔ موجود ہونے اور نہ ہونے کا اختیار اِن کے پاس نہیں تھا۔ خدا کے سوا جو کچھ ہے وہ اپنے آپ نہیں ہو سکتا، اگر ہوگا تو خدا کے کرنے سے ہوگا۔ خود بخود کا لفظ صرف خدا کے ساتھ ہے۔ غیرِ حق کا وُجود اور صفات عکسی حیثیت رکھتے ہیں۔ شخصی وجود واحد ہے اور عکسی وجود کثیر یعنی کثرت عکسی ہے۔ جس کا وجود ہی اصلی اور حقیقی نہیں اس کی صفات بھی اصلی اور حقیقی کیا ہوں گی! خدا اپنے آپ ہے دوسرے ہوں نہ ہوں، خدا کو فرق نہیں پڑتا۔ نبی کی ذات حق اور خلق کے درمیان واسطہ ہوتی ہے۔ وہ اللہ کے بندوں کا ہاتھ پکڑتا ہے اور اللہ کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ نبی کے سوا وہ کسی کو اپنے اور دوسروں کے درمیان واسطہ نہیں بناتا۔ اللہ کی ظاہری معنوی عطاؤں (وجود اور صفاتِ وجود) کے درمیان نبی واسطہ ہیں اور اس میں بھی پہلا اور واحد واسطہ آپ ﷺ ہیں۔ نبی کو جو وجود اور قوتیں دی جاتی ہیں وہ اکتسابی نہیں وہبی ہیں۔ نبی کے سوا وہ وہبی چیز کسی غیر نبی کو نہیں دی گئی۔ نبی میں خدا کی صفات کا انعکاس ہے اور دوسری چیزوں میں اُس انعکاس کا انعکاس ہے۔ نبی کے نبوی کمالات کو خدا کے سوا اور کوئی نہیں جان سکتا یعنی نبی را خدا می شناسد۔

بہرحال اللہ کی ذات مطلق ہے۔ نبیوںؑ کا مطلق بالذّات اور حقیقی کچھ نہیں لیکن اس غیر حقیقی کا مطلب فرضی نہیں ہے بلکہ خدا کے دینے سے ہے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہے ہی نہیں بلکہ ہونیت اور نا ہونیت برابر لگے ہوئے ہونے کے اعتبار سے غیر حقیقی اور عکسی کہہ رہے ہیں۔ نبی کے عکس کی عکاسی غیر نبی میں ہوتی ہے۔ انسان، ملائکہ اور اجنّہ کا درجہ دوسری تمام مخلوقات سے زیادہ ہے کیونکہ ان میں علم، ارادہ،

قدرت اور اختیار کا خانہ ہے اگرچہ وہ اختیار مطلق اور لا متناہی نہیں۔ انبیاء کرامؑ اور پھر انسان، ملائکہ اور اجنّاء میں وجود اور صفاتِ وجود کی اتنی شانیں ہوتی ہیں کہ ان پر لا متناہیت کا دھوکہ ہو جاتا ہے لیکن ان میں سے کسی کو دوسرے کے بارے میں ویسا علم نہیں ہو سکتا جیسا علم جنابِ حق تعالیٰ کو ہے۔ نبی کی معرفت جیسی خود خدا کو ہے ویسی خود نبی کو بھی نہیں کسی اور کو تو کیا ہونی ہے۔ نیچے والا تو بلندی والے کو کیا سمجھے گا، برابر والا بھی جان سمجھ نہیں سکتا۔ خدا کا انعکاسِ اوّل اور انعکاسِ اتم آپ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ میں ہے، پھر اس کا انعکاس انبیاء کرامؑ میں اور پھر اس انعکاس کا بھی انعکاس باقی مخلوقات میں۔

غیرِ حق کو وجودِ مستقل تو کیا وجودِ انضمامی بھی حاصل نہیں۔ اور جو عارضی وجود ہے وہ عکسی ہے۔ جب وجود ہی ذاتی نہیں تو پھر کیا چیز اصلی؟! اصلی اور حقیقی کے معنی تو غناء اور صمدیَّت ہیں اور یہ بہرحال کسی کو حاصل نہیں، عظمتیں تو تیں جتنی مرضی ہوں اور وہ اتنی اور ایسی ہیں کہ نبی کی صلاحیتّوں کو صرف خدا ہی جانتا ہے۔ پھر یہ کہ ملائکہ تو مقبول ہی مقبول ہیں، ان میں تو خیر ہی خیر ہے کیونکہ ان میں خیر و شر میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا نہیں ہے۔ ملائکہ، دوسرے سارے جاندار اور بے جان تو پکّے مُطیع اور مومن ہیں، ہر وقت اطاعت اور محکومی پر ہیں۔ حکم برداری اور حکم نابرداری تو صرف انسان اور اجنّاء میں ہے یعنی ان کا اختیاری اسلام ہے اور اختیار کے معنی ہیں اپنے اختیار سے اپنی بے اختیاری کا فیصلہ۔ اسی فیصلے کا نام اسلام ہے یعنی اپنی من مانی سے نہیں چلنا بلکہ خدا کے حکم اور مطالبے پر چلنا ہے۔ اپنی رائے سے اپنی رائے کو چھوڑ دینا ہے یعنی مکمل دست برداری۔

۱۰۔ شے کا لفظ شاء سے نکلا ہے، اور شاء کے معنی ہیں چاہنا۔ کرسی، میز، درخت، چرند، پرند، غرضیکہ سب اللہ تعالیٰ کی چاہنّیت ہے۔ اسی لئے چیزوں کو اشیاء کہا جاتا ہے کہ وہ سب جنابِ حق تعالیٰ کی چاہنیتوں کی شکلیں ہیں۔ وہ چاہیں کہ چاند دو ٹکڑے ہو جائے، تو یہ ہو جائے۔ وہ سیلاب چاہیں، تو چاہیں! اور پھر سیلاب سے آبادکاری چاہیں، تو آبادکاری ہو جائے۔ معجزہ کرامت بھی اُن کی چاہنّیت ہے۔ انہوں نے چاہا کہ یوں ہو جائے اور ویسا ہو گیا۔ سیّد مراتب اختر علیؒ فرماتے تھے کہ جتنا بھی قرآنِ کریم پڑھا سمجھا، بس ایک بات سمجھ آئی کہ ہر ہر بات کے ساتھ مَن یَّشاء تو لگا

ہی ہوا ہے۔

۱۱۔ وحدتُ الوجود کی گفتگو میں عینیت اور مغائرت ایک اہم مسئلہ ہے۔ ان میں سے کسی ایک کا انکار کرنے سے شرک ہو جاتا ہے یعنی اگر صرف عینیت کا اقرار کیا جائے اور غیریت کا انکار یا vice versa تو شرک ہو جائے گا۔ شرک اور کفر ہم معنی نہیں۔ حق میں خلق کی کوئی بات شامل کرنا یا حق کی کسی بات کی نسبت خلق سے کرنا یہ شرک ہے اور خلق میں حق کی کوئی بات نظر آنا کفر۔ منافقت ایک علیحدہ گناہ ہے لیکن اس میں بھی ایک ہے نفاقِ اعتقادی اور ایک ہے نفاقِ عملی۔ نفاقِ عملی کسل ہے یعنی عقیدے اور عمل میں فاصلے کو نفاقِ عملی کہا جاتا ہے۔ دہریت اور الحاد ایک ہی چیز کا نام ہے اور زندقہ کے معنی ہیں کہ غیر اسلامی افکار و اعمال کو عین اسلامی سمجھے بھی جانا اور آگے سمجھائے بھی جانا۔ شیخِ اکبر حضرت محی الدین ابنِ عربیؒ کے مطابق وجود تو بلاشک وشبہ ایک ہے کیونکہ وجود کبھی دو نہیں ہو سکتے۔ جب وجود ہے ہی ایک تو دو کہتے ہی شرک ہو گیا۔ وجود ایک کہہ کر کسی نے یہ مراد نہیں لیا کہ حق میں خلق کی یا خلق میں حق کی کوئی بات پائی جاتی ہے۔ صوفی ہونا یا باخبر سالک ہونا یہ ہے کہ حق کا مقام حق کو اور خلق کا مقام خلق کو دے۔ وجود واحد ہے اور ذوات دو۔ ایک ذاتِ حق اور ایک ذاتِ خلق۔ ذاتِ حق کے اعتبارات ذاتِ حق کے لئے ہیں۔ ذاتِ حق کا جو کچھ ہے وہ ذاتی شخصی مستقل اور غیر متبدل ہے۔ وہ ذات کُن سے پہلے جو تھی اور جس طرح تھی اور جن اوصاف وکمال کے ساتھ تھی، کُن کہنے کے بعد بھی اس میں ذرا تغیر نہیں ہوا۔ جنابِ غفُّور کے واحد ہونے پر کوئی تکثُّر نہیں آیا۔ یہ نہیں کہ پہلا دو مرتبہ ہو گیا یا جتنی چیزیں ہیں وہ اتنی مرتبہ ہو گیا۔ ایسا ہرگز ہرگز بھی نہیں۔ شانِ تنزیہہ ویسی کی ویسی ہے۔ کسی صوفی ولی نے وحدتُ الموجودات کا لفظ کبھی نہیں لکھا بولا بلکہ وجود کو ایک کہا کیونکہ وجود ہے ہی ایک۔ وُجود ذاتِ حق کی صفت ہے اور اس صفت کی نسبت صرف حق تعالیٰ سے ہے۔ اگر کثرت نظر سے اوجھل ہو جائے اور صرف ایک وجود نظر آئے تو یہ حال ہے۔ علم، معرفت اور معائناتِ روحی سے جب یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ وُجود واحد ہے اور حقیقت میں صرف جنابِ حق صاحبِ وُجود ہیں تو یہ حال کا مسئلہ نہیں بلکہ یہ حقیقتِ حال ہے۔ وحدتُ الوجود ایک علم معرفت کی بات ہے،

فقط حال کی بات نہیں۔ جب صرف ایک وہی مشہود ہوں تو یہ حال کہلائے گا اور حقیقتاً صرف وہی حقیقی وُجود ہے یہ حقیقتِ حال کہلائے گی۔صفتِ وجود کُن سے پہلے اور بعد بھی پوری کی پوری انہی کی ہے۔ دوسری موجودیاں (existents) اپنی ذات سے بے وجود ہیں یعنی خارجاً معدوم ہیں۔انہیں جو خارجی وجود ملا وہ وجودِ واحد کی تجلّی سے ملا۔جب وجودِ خارجی دے دیا گیا ہے تو اب عدمِ محض کا لفظ تو جائے گا اور عدمِ اضافی کا لفظ آئے گا۔ایک مضاف الیہ حقیقی ہے یعنی ذاتِ حق اور وہاں ذات اور وجود ایک دوسرے کے قطعی اور یقینی عین ہیں جبکہ خلق میں ذات اور وجود ایک دوسرے کا عین نہیں۔ ذاتِ خلق کا اپنا ذاتی وجود نہیں بلکہ اُسی وجودِ حقیقی کی ایک نسبت ہے جس کے سبب یہ موجود و محسوس ہوتے ہیں لیکن معقول نہیں ہیں۔جب عقل کام کرے گی تو عدمِ اضافی پالے گی۔ایک حقیقی وجود ہے اور ایک عکسی وجود۔جس طرح آئینے میں عکس لہراتے ہیں،موجودات میں بھی وجودِ حقیقی کے عکس لہراتے ہیں اور آئینے میں جو عکس لہراتے ہیں وہ عکس ہونے کے اعتبار سے موہوم و متخیل کہے جاتے ہیں ۔اسی لئے غیرِ حق کو ہم موہوم و متخیل کہہ رہے ہیں۔جس طرح عکس حسّی واقعی ہوتا ہے اسی درجے میں غیرِ حق کا وجود بھی حِسّی واقعی ہے۔اور حسّی واقعی ہونے کی سطح پر ہی شرع، کفر اور ایمان کی بحث ہے۔ایک سوال یہ ہے کہ کیا پانی آئینے کے جسم میں سرایت کر گیا؟ ایسا ہرگز بھی نہیں ہے۔نہ سریان ہوا اور نہ ہی حلول۔جس طرح پانی اور عکس دو ہیں، ان میں کسی قسم کا کوئی سریان و حلول نہیں اسی طرح جہاں سے عکس آرہے ہیں وہاں بھی کوئی تبدیلی نہیں۔آئینوں کے سائز،ہئیت اور پانی کی وجہ سے عکس اور شخص میں جو علیحدگی ہے وہ تو رہے گی۔پھر عکس اپنے موجود ہونے اور موجود ہوکر رہے جانے میں شخص کا مستقل محتاج ہے۔عکس کا احتیاج شخص سے نہ ختم ہونے والا ہے لیکن شخص تو عکس کا قطعی بھی محتاج نہیں۔جو الزام وحدتُ الوجود والوں پر لگایا جاتا ہے کہ عیوب کی نسبت حق سے کر دیتے ہیں تو ایسا بالکل بھی نہیں۔حق تو جو ہے وہ ہے اور اس میں کوئی تغیر نہیں واقع ہوا یعنی کُن کے نتائج ہوکر بھی وہ الآن کما کان ہیں۔یہ ان کی تنزّہ ہے اور یہی تشبُّہ بن گیا چنانچہ تنزیہہ تنزیہہ ہونے میں تشبیہہ بھی ہے اور تشبیہہ تشبیہہ ہونے میں تنزیہہ۔یہی صفت وجود کی وحدت ہے۔صفت میں تحدید نہیں،تحدید تو عکس میں ہے یعنی سائز اور ہئیت میں۔جو عینیت شخص اور عکس میں ثابت کی گئی ہے اس

کی نفی سے شرک ہو کے رہے گا کیونکہ عینیت کی نفی کا مطلب ہے کہ چیزیں اپنے کمال پر خود بخود ہو سکتی ہیں اور رہ سکتی ہیں۔ وحدتُ الوجود کو مانے بغیر شرک سے بچت نہیں ہو سکتی لیکن یہ شرک شرکِ خفی ہو گا۔ مراتبِ وجود یا تنزلاتِ ستہ حقیقت کو سمجھنے کے لئے ہے۔ ذاتِ حق کو مراتبِ وجود میں جو بیان کیا جاتا ہے یہ صرف سمجھنے سمجھانے کے لئے ہے۔

مراتبِ علمیہ

احدیت　　　وحدت　　　واحدیت

مراتبِ عینی

عالم ارواح　　　عالم مثال　　　عالم ناسوت

تنزلات کے معنی یہ نہیں کہ ذاتِ حق مختلف مدارج میں نزول کر گئی یعنی احدیت سے وحدت میں آ گئی اور وہاں سے واحدیت میں اور پھر اگلے مراتب میں۔ ایسا ہرگز نہیں بلکہ یہ تو سالک کے علم و شُہود کے اعتبار سے ہے، اپنے ہونے کے اعتبار سے نہیں۔ اب یہ غلط فہمی ہو رہی ہے کہ ذاتِ حق نزول فرما گئی اور ہر ہر چیز میں سرایت کر گئی۔ ایسا تو کوئی جاہل ہی سمجھ سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ ایک یہ غلط فہمی بھی ہے کہ ناسوتیت قریب ہے اور اس کے بعد مثال اور پھر عالمِ ارواح اور احدیت سب سے دور۔ جس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ذاتِ حق کہیں بہت دور بہت دور ہے۔ اگر وحدتُ الوجود کے اصول کو نہ مانا جائے تو کئی آیات کی تاویل باطل کرنا پڑتی ہے۔ قرآنِ کریم میں جہاں ذاتِ حق کے بارے میں آیا ہے کہ حبلِ الورید، اِنّی قریب اور ان کے ہر چیز کو محیط ہونے کی جو آیات ہیں ان کی کیا تاویل کی جائے گی اگر اصولِ وحدتُ الوجود کو نہیں ماننا۔ ذاتِ حق ہر چیز کو محیط ہے اور ہر چیز کا اطلاق ہماری روح، ہمارے 'میں پن' اور ہر ذہنی مادی چیز پر ہو گا۔ پھر اقربیت اور معیت کی آیات بھی ہیں۔ اُن کا محیط ہونا، اُن کا قریب ہونا۔ اب ان آیات کی تاویل کیسے کریں گے اگر وحدت الوجود کا انکار کریں گے۔

وجود اور ذات دونوں ایک ہیں۔ وہاں علم اور ذات قطعی ایک ہیں۔ قدرت، مشیّت اور ذات بھی ایک ہیں۔ ذات اور نفاذِ قدرت و مشیت اور پھر اثرِ نفاذِ قدرت۔ ذات کا سراغ تو صفات سے ملتا ہے۔ اور

اشیا تو صفات کا کھیل ہے۔غیرِ حق کی صفات حقیقی اور مستقل نہیں ۔ یہ چیزیں یہ موجودیاں اگر اپنے طور پر ہوں تو پھر یہ مستقل رہا کریں۔غیرِ حق میں صفات کا آنا جانا لگا ہوا ہے۔ جب غیرِ حق کی کسی صفت کو استقلال نہیں اور اس کا کچھ ایسا نہیں کہ جو مستقل اور ذاتی ہو تو ذات تو دو خود بخود ہو گئیں ۔ایک وہ جو اپنے آپ ہے اور جس کا سب کچھ ذاتی اور مستقل ہے، اور ایک ذات وہ جس کا کچھ اپنا نہیں یعنی جو ہونے میں بھی پہلے کی محتاج اور ہو کر رہے جانے میں بھی محتاج۔ اشیاء میں ذاتِ مطلق کی تجلی ہو گی تو دوسرے سارے ہو لیں گے۔ متجلّٰی لہٗ کی ذات وصفات کا سرچشمہ ذاتِ حق ہے۔ متجلّٰی ہے تو تجلی ہے اور تجلی ہے تو متجلّٰی لہٗ ہے۔ یہ وجود اور صفاتِ وجود کا مستقل اثر ہے جسے اشیاء کی شئیت کہا جاتا ہے اور شئیت تو صفات سے معلوم ہوتی ہے۔غیرِ حق کی صفات موصوفِ حقیقی کی صفات ہیں اور غیرِ حق سے ان صفات کی نسبت ہو کے بھی وہ وہیں کی وہیں ہیں۔ ذات وصفاتِ حق میں کچھ تغیر نہیں واقع ہوا۔ زمان و مکاں بھی وحدتُ الوجود کا مسئلہ ہے۔ زمان ومکاں بھی ان کی مخلوق ہیں۔خالق مخلوق میں کیسے محدود و محصور ہوسکتا ہے! سوچنے کی بات ہے کہ کیا ماضی حال مستقبل ان الفاظ کا اطلاق ذات پر ہوتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ وہ تو وراءثم وراءالوراء ہیں۔ان کی ابتدا بے ابتدا ابتدا ہے اور ان کی انتہا بے انتہا انتہا ہے۔ ازل اور ابد تو ان کی مخلوق ہے۔ وہ تو ازلِ بے ازل اور ابدِ بے ابد ہیں۔ ھوالظاھر بھی ہیں اور ھوالباطن بھی، ھوالاوّل بھی ہیں اور ھوالآخر بھی۔ ان کی کوئی صفت دوسری صفت کے متقابل نہیں۔ ھوالظاھر ہونے میں وہ عین ھوالباطن ہیں اور ھوالاوّل ہونے میں عین ھوالآخر ہیں۔

ذاتِ حق عین علم ہے اور علم عین ذاتِ حق۔ ذات وصفات کی عینیت کی گفتگو اور غیریت یا صفات کا زائد علی الذات ہونے کی بحث تو متکلمین نے چھیڑی ہے۔ جبکہ اصولی بات تو یہ ہے کہ کیا ذات کبھی بغیر صفات کے بھی تھی؟! کیا صفات اور ذات میں فاصلہ تھا؟ کیا صفات کے متعدد ہونے سے ذات بھی متعدد ہو گئی ؟ تو ایسا ہرگز نہیں۔ جب ایسا ہے ہی نہیں تو عینیت غیریت کی بحث ہی کیا! اللہ کی معرفت اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ عقل، وجدان، قلب، سرّ اور روح کو جو بھی مُکاشفات ومعائنات ہوتے ہیں اُن کی بھی حقیقت کیا ہے۔ جس کو مکاشفات ہوئے اور جو مکاشفات ہوئے، سب انعکاس

ہی ہے۔ اللہ کی معرفت غیرِ حق پر حرام ہے۔ وہ خود اپنے عارف ہیں۔ وہ جنابِ سبحان ہیں کہ جہاں عقل، وجدان، روح کسی کی مجال نہیں کہ پَر مار سکے۔ ظہور تو ذات وصفاتِ حق کا ایک منطقی نتیجہ ہے۔ چیزیں خدا نہیں لیکن خدا ہر چیز میں ہے۔ جن حوالوں سے عینیت ہیں ان حوالوں سے عینیت اور جن حوالوں سے غیریت ہے ان حوالوں سے غیریت۔ ذاتِ حق کے سوا اور ان کے وجود کے سوا کہیں کچھ نہیں۔ ذاتِ حق ہے تو عکوس بھی ہیں یعنی موجودیاں بھی ہیں لیکن شخص عکس نہیں اور عکس شخص نہیں اور یہ بات بھی بالکل درست کہ شخص عکس ہے اور عکس شخص۔ آئینہ اور عکس رہے نہ رہے شخص تو رہے گا۔ عینیت اپنی جگہ مسلّم ہے اور غیریت اپنی جگہ۔ جب غیریت بھی ہے تو احکامات بھی ہیں۔ نیکی بدی، کفر ایمان، آب سراب۔ یہ سب ہیں اور ان کے واضح احکامات ہیں۔ جب عینیت کی بات ہوگی تو عینیت بھی ثابت ہے۔ جنابِ حق تعالیٰ نے ہر چیز کو اپنی تمثیل بنایا۔ ان چیزوں کو سمجھ لیں تو سب سمجھ میں آجائے گا اور پھر ذاتِ حق بے نقاب نظر آئے گی۔ امجد حیدرآبادیؒ جو حضرت سید سلیمان ندویؒ کے عاشقِ زار ہیں انہوں نے اپنی رباعیات میں وحدتُ الوجود کے اصول کو بیان کیا۔

ہیں مستِ مئے شُہود ، میں بھی تو بھی
ہیں مدعیٔ نُمود ، میں بھی تو بھی
یا تُو ہی نہیں جہاں میں یا میں ہی نہیں
ممکن نہیں دو وُجود ، میں بھی تو بھی

(۱) وحدۃ الوجود: پہلے طے کیا جائے کہ اصل سوال کیا ہے؟ سوال اصل میں
کیا ہے؟ صحیح جواب کے لیے سوال کی حقیقت جاننا، موضوع سوال
کا تعین ضروری۔ اکثر بیشتر سوال ہی غلط، اصلاح، جزوی
یا بے ترتیب اور بے تکے سوال ہی کی غلطی۔

(۲) یہ سوال خود ذاتِ الٰہی، صفاتِ الٰہی سے متعلق (براہِ راست)
سوال نہیں ہے۔ خدا کیا ہے؟ یہ معلوم کرنا مقصود نہیں
خدا اور مخلوقات کے تعلق کی نوعیت معلوم کرنا
آدمی، دنیا اور چیزوں کا تعلق خدا سے۔ اور اس سوال سے پہلے
یہ سب کیا ہیں؟ کہاں سے ہیں؟ کس طرح ہیں؟ خود یہ کیا ہیں، ہونا
اور ہونے میں یہ ہونا؟ دوسرا یہ کہ ان سوالوں کا جواب
کس حیثیت سے؟ ہر چیز کی حیثیت۔

(۳) مفہوم وجود اور موجودات کا فرق؟
(۴) ذات اور وجود کا فرق؟
(۵) خدا کی ذات، وجود کا رشتہ
(۶) مخلوق، آدمی، چیزوں کی ذات اور وجود کا رشتہ؟
(۷) وجود واحد؟ ذات کثیر - ذات کثیر کی
حقیقت اور حیثیت، اصلیت
Reality, status, meaning?
حق اور مخلوق کا فرق

Contingent / Necessary Being

ممکنات — وجود واجب
ذاتِ ممکن — وجود مطلق
ذات واجب
وجود واحد

ظہورات، تجلیات، تعینات، کثرت
اے از ہمہ ظہور، اے رہبرِ خفا، (صفی)

خدا ہے یہ اور چیزیں اس کے متوازی مقابل
کون کہتا ہے اندر، کون کہتا ہے باہر

things
alongside
خارج ہے کون ؟!!

Exterior to God.

خدا چیزوں سے ہے، چیزیں ہیں خدا میں

Transcendent
(تکوین) A Infinite
محیط

کس اعتبار سے جدا، کس اعتبار سے ایک کا ایک
ایک، کس کا ایک ہے کا ایک، ایک کا ایک، ایک ہی ایک — وجود میں
کس نسبت سے کی ایک، ؟ شعور وجود، شعور بے خبر ؟!!

؟!! / Future - Present - past کی خدا ہے چیزوں
Future Present - past کا چیزیں ہیں خدا — اقرب الیہ

خدا ہے خدا تو بے کسی طور کیسے،
Infinite
The Possible

چیزوں میں صفت وجود، چیزوں کی ماہیت !! A
(موجودیں، ہستی)

To be
Being Existent

ہستی فی ذاتہ [illegible] فی الفنا و در بقا
خود وجود [illegible] آزاد ہونا، خود گرفتار ہونا

لا یوجد الاشیا وھو عینہا - اعیان نے ہی تو وجود [illegible]
عین اعیان، اعیان کا رشتہ [illegible]

x 90-100 - (10)

۹۰ سے ایک ہی کی تکرار، ۱۰۰ سے ایک ہی کی تکرار اس طرح دونوں ایک
تکرار ۹ کا ۹۹ ہونا، ۱۰۰ کا ۱۰۰ ہی ہونا ان دونوں کی ماہیت
الگ الگ، اصل وجود ایک

جب آپ وجود مطلق کو بلا لحاظ تعینات

یاد کریں گے تو یہ وجود باری ہے اور جب آپ

علمی لحاظ سے سب تعینات محسوس کریں گے تو

یہ روحانیات ہے اور جب علمی لحاظ اعراض دیکھیں گے

تو یہ "مادیات" ہے اور وجود انسانی سے مراد

"وجود مطلق" ہے اور روح انسانی کا مرکز وہ روح

ہے جو مجموعہ تعینات انفس و آفاق ہے اور

جسم انسانی سے مراد خلاصہ مادیات انفس و آفاق ہے

اب مرکز احساس انسانی جسم کا لطیف

مرکز ہے: "آپ کی صفت جمالی کو کسی دوسرا مترادف

صفت .....

Next page

شانِ اہلِ بیت وشانِ صحابہ

۱۔ چار یارؓ میزانی اعتبار سے بعد از انبیاء کرام تمام بنی آدم سے برتر ہیں اور ان کی ترتیب مجموعی نمبروں کے اعتبار سے وہی ہے جو ترتیبِ خلافت ہے۔ لیکن وجاہت کے علیحدہ نمبر ہیں۔ امرِ خلافت میں جنابِ سیّدنا عثمانؓ مقدم ہیں لیکن مرتبۂ قرب و وجاہت میں جنابِ سیّدنا علیؓ فضیلت رکھتے ہیں۔ Post wise جنابِ سیّدنا عثمانؓ senior ہیں، لیکن ذاتی تعلق آپ ﷺ کا جنابِ سیّدنا علیؓ سے ہے۔ تین اعتبار سے جنابِ سیّدنا علیؓ سب سے افضل ہیں لیکن جب یہ بات کسی پر ظاہر کی جاتی ہے تو اکثر پھسل جاتے ہیں۔

۱) قربِ نبوی کے اعتبار سے جنابِ سیّدنا علیؓ کو فضیلت حاصل ہے۔

۲) روحانی مراتب کے اعتبار سے جنابِ سیّدنا علیؓ سب سے افضل ہیں۔

۳) عالَمِ ارواح میں فیصلے آپؓ کی رضامندی سے ہوتے ہیں۔

لیکن ایک ہے محبت اور ایک ہے کسی کے کمالات کی اسناد جاری کرنا۔ آپ ﷺ کو محبتِ خاص اہلِ بیتِ کرامؓ سے بہت زیادہ ہے۔ لفظِ تعلق کی احادیثِ مبارکہ صرف اہلِ بیتِ کرامؓ کے لئے ہیں۔ روحانی و علمی سرداری تو ہر عہد میں فاطمی (سادات) کو ملی ہے۔

۲۔ نسب اعمال کی ایک زنجیر ہے اور اس کے اثرات بھی ہیں۔ اعمال کی دو categories ہیں۔ وہبی اعمال اور کسبی اعمال۔ اعمال وہبی ہوں یا کسبی اُن کے اثرات آگے نسل میں منتقل ہوتے ہیں۔ کارنامے چاہے وہبی ہوں یا اکتسابی، اپنا اثر رکھتے ہیں جو کہ آگے وراثت کے طور پر منتقل ہوتا ہے۔ جب دس بیس نسلیں گزر لیتی ہیں تو گزرے ہوؤں کے اعمال وافکار کی تاثیریں genetically آگے transfer and transmit ہوتی ہیں۔ نسل ایک الگ قوت ہے، دعا ایک الگ قوت ہے اور استعدادیں ایک الگ قوت۔ لیکن آخری فیصلہ کن قوت تو عشق ہے۔ حضور باوا صاحب (حضرت فرید الدین گنجِ شکرؒ) کی وجہ سے ان کے شہر کے پتھروں کی بھی عزت ہے تو جن کی

رگوں میں اُنؓ کا لہو ہے ان کی عزت ان کا احترام کتنا کیسا ہونا چاہیے! قرآنِ کریم میں تابوتِ سکینہ کا قصہ بیان کیا گیا ہے، اس پہ غور کرنا چاہیے۔ اب جن کی رگوں میں خونِ رگِ رسول ہے ان کا کتنا اور کیسا احترام کرنا چاہیے۔ پانچ تنؓ کی تو بات ہی انوکھی ہے۔ Genes کی characteristics میں believe کرنا کوئی نسل پرستی نہیں۔ جو کچھ آپ ﷺ کو عطا ہوا، کیا وہ genes میں travel نہیں کرتا تھا؟!

۳۔ آپ ﷺ کے دستِ اقدس پر اسلام لانا اور براہِ راست زیارت اور اکتسابِ فیض کے نتائج و اثرات ایسے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کے سوا وہ کسی کو حاصل نہیں۔ مجموعی فضیلت میں صحابہ کرامؓ غیر صحابہ سے بڑھے ہوئے ہیں لیکن مجموعی فضیلت کے معنی یہ نہیں کہ جزئی فضیلتوں میں کوئی اور نہیں بڑھ سکتا۔ لہٰذا غیر صحابی جزئی فضیلت میں بڑھ سکتا ہے۔ ہمیں یہ آسانی دی گئی ہے کہ ہم دسواں حصہ کر لیں تو خدا کے مقرّب بندے بن جائیں اور صحابہ کرامؓ اگر دسواں چھوڑ دیں تو ان کی گرفت ہو جائے۔

ولی وہ ہوتا ہے جو انجذابِ رنگِ محمدی بطرزِ صحابہ کرتا ہے اور جتنا جیسا انجذاب ہو گا اُس درجۂ انجذاب و اتّصال کو مرتبۂ ولائت کہتے ہیں۔ جسے خدا کہے کہ یہ بندہ میرا مقبول، بس وہی ولی۔ وجاہت عطا کیے جانا خالص عطا ہے، اس میں اکتساب کا کوئی شعبہ نہیں۔ چنانچہ مقبول اور نامقبول برابر نہیں اور مقبولیت بھی فرداً فرداً vary کرتی ہے، چنانچہ انسان مساوی نہیں، ان میں افضل اور مفضول ہیں۔ اصل وجاہت تو خدا کو معلوم ہے کہ کون کتنا مقبول ہے یعنی کسی کی وجاہت کا قطعی علم صرف اللہ کو ہے، ہم کچھ نشانیوں سے معلوم کر لیں تو کر لیں۔ انسانوں کی درجہ بندی ہے۔ نامحبوب کبھی بھی محبوب کی حقیقت نہیں سمجھ سکتا۔ جو جس درجہ کا محبوب ہوتا ہے وہ اسی درجے کا انسانِ مرتضٰی، انسانِ مصطفٰی اور انسانِ مجتبٰی ہوتا ہے۔ مرتضٰی، مصطفٰی اور مجتبٰی ہونے کی حقیقت تو صرف خدا کو معلوم ہے، انسان نشانیوں سے کوئی ظنّی علم رکھ لے لیکن وہ قطعی علم تو نہیں ہو گا۔ صاحبِ تقرّب، صاحبِ وجاہت، صاحبِ اختصاص۔ یہ ولائت کے درجے ہیں۔

جس طرح نبی حق اور خلق کے درمیان واسطہ ہوتا ہے، اسی طرح اللہ کا ولی، زندہ یا وصال شدہ، وہ آپ ﷺ اور خدا تک پہنچنے کا ایک واسطہ ہے۔ سبب اور مُسبِّب کا ایک تعلق ہے۔ شیخ سبب ہیں مُسبِّب نہیں ہیں۔ مُسبِّب کے ارادے اور حکم کے بغیر کسی سبب کی مسببِّیت کام نہیں کر سکتی۔ شیخ کی عظمت اس وجہ سے ہے کہ مُسبِّب نے مسبَّب میں جتنی قوت رکھی اُتنی مسبَّب کی قوتِ فیضان اور تعلیم وتربیّت کی اثر آفرینی ہوگی۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ شیخ کے چاہنے سے ہوتا ہے بلکہ وہ تو ارادۂ ربّانی ہوتا ہے، رحمتِ حق ہوتی ہے۔ رحمتِ حق اپنے آپ کو اُس سبب کے آئینے (توسُّل) میں ظاہر کرتی ہے۔

۴۔ مشاجراتِ صحابہ ہمارے ہاں ایک موضوع کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ لفظِ مشاجرات کے معنی ہیں ایک شجر کی ٹہنیاں۔ اب ٹہنیوں میں جنگ کا لفظ کہاں سے آ گیا؟! قرآنِ شریف میں کُل صحابہ کرامؓ کے لئے رحماء بینھم کے الفاظ آئے ہیں۔ جب یہ فرما دیا گیا تو اب ہم مؤرخ کی بات پر چلیں گے یا قرآن پاک کی! قرآنِ کریم کو تاریخ کی روشنی میں پڑھنا ہے یا تاریخ کو قرآن کی روشنی میں؟! اس سے ساری بات واضح ہو جاتی ہے۔ اگر ہم صحابہ کرامؓ کے بارے میں لڑائیوں والا نظریہ رکھتے ہیں تو پھر پتہ نہیں انہوں نے دین ہم تک صحیح پہنچایا بھی یا نہیں۔ صف بہ صف بات چلی آ رہی ہے اور اگر پہلی صف والوں کو لالچی اور غلط سمجھیں گے تو پھر بات کہاں پر جائے گی! حدیثِ مبارکہ میں صحابہ کرامؓ کے بارے میں آتا ہے کہ سارے صحابی دین کے مسائل میں بالکل ٹھیک رستے پر ہیں۔ ہر صحابی بلا استثناء بلند درجے پر ہیں اور اُنؓ کا ایمان کسوٹی ہے۔ جن ہستیوں کا یہ مقام ہو ان پر ہم تنقید کرتے ہیں اور آج کل عالم حضرات بھی تاریخ کے زور پر لکھتے بولتے ہیں تو پھر قرآن کے عالم تو نہ ہوئے۔ تاریخ دان جو supply کر گئے یا کر رہے ہیں وہ smuggling اور جُو انہیں تو اور کیا ہے! جنگ کا تو لفظ ہی نہیں وہاں۔ کچھ صحابہ کرامؓ کا مطالبہ تھا کہ حضرت سیدنا عثمانؓ کے قاتلوں کو فوری سزا دی جائے اور حضرت سیدنا علیؓ یہ فرماتے تھے کہ عدالتی کاروائی کے بغیر یہ کام نہیں ہوگا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ ٹھیک تھے۔ مذاکرات چل رہے تھے اور مفاہمت کی کوششیں اخیر کامیاب ہو رہی تھیں تو سازشیوں نے جنگ چھیڑ دی۔ دونوں فریق یہ سمجھے کہ ہم پر حملہ ہو گیا ہے لیکن جب پتہ چل گیا

تو جنگ روک دی گئی۔لیکن اب جنگِ جمل کا ڈرامہ رچایا ہوا ہے مؤرخین نے۔ جسے جنگِ صفین لکھا بولا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت سیدنا علیؓ کی خلافت تو ہو چکی لیکن حضرت امیر معاویہؓ کے ساتھ اختلافی صورتِ حال تھی۔اور اس سے سازشیوں نے پھر فائدہ اٹھایا۔ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مجتہدِ مطلق کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنا اجتہاد کرے۔صحابہ کرامؓ سارے کے سارے مخلص تھے۔اصل بات تو یہ ہے کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح ہم ہیں صحابہ بھی اسی طرح کے ہوں گے۔اسی سے ساری خرابی جنم لیتی ہے۔اور یہ تو نہایت غلط ہے کہ صحابہ کرامؓ کی marking ہم کریں۔ہم کوئی اُن پر judge لگے ہوئے ہیں۔اگر صحابہ کرامؓ پر تنقید کی جائے گی تو دراصل وہ تنقید آپ ﷺ پر ہو گی کہ آپ ﷺ (نعوذُ باللہ، خاکم بدہن) تربیت صحیح نہیں فرما سکے۔بہت احتیاط لازم ہے۔درس گاہِ نبوت کے degree holders کے بارے میں ہمارا عقیدہ کیا ہے؟ اختلافِ صحابہ کا جو نقشہ آج کل لوگ کھینچ رہے ہیں یہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ پر indirect تنقید ہے،اور اس سے کفر لازم آنے کا اندیشہ ہے۔مکتوباتِ مجددی میں حضرت مجدد صاحبؒ نے نہایت توازن کے ساتھ اس مسئلے پر تحریر فرمایا ہے۔سب سوالوں کا جواب مکتوبات میں موجود ہے۔

عظمتِ صحابہ کو نہ ماننے سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ بات اللہ کے انکار تک پہنچ جائے گی۔جب اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کو کسوٹی قرار دیا تو کسوٹی پر اعتراض تو اُنؓ کو کسوٹی بنانے والے پر اعتراض ہو گیا۔اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو مبعوث فرما کر جس طرح کے انسانوں کی تخلیق چاہتے تھے،ویسی تربیت آپ ﷺ نے کر دی۔اب آپ ﷺ کے تربیت یافتہ انسانوں میں کوئی ایسی چیز دیکھنا جو انسان کے عظیم ہونے کے منافی ہو تو یہ صریح کفر ہے۔تاریخ عقیدے کی روشنی میں پڑھیں گے یا عقیدے کو تاریخ کی روشنی میں بنائیں گے؟!یہ ایمانی بات ہے۔اس کا فیصلہ کر لیں اور اس فیصلے کا ہونا ہی مسلمان ہونا ہے۔عقیدے اور تاریخ کا تعلق ٹھیک سمجھ لیں۔مؤرخ کیا وحی اتار رہے ہیں؟ عباسیوں نے اُموی دور کی تاریخ جلا کے راکھ کر دی اور نئی تاریخ لکھوائی۔بعد میں آنے والوں نے اُمویوں کی تاریخ کو جلا کے راکھ کر دیا۔ ایسی تاریخ کا کیا اعتبار!اور قرآنِ کریم تو انّا لهٗ لحٰفظون ہے۔

باب پنجم

علمی و منطقی مباحث

۱۔ آجکل اکثر لوگ یہ کہتے ہیں کہ قال نہیں حال چاہیے۔ یہ بات غلط ہے کیونکہ کوئی حال بغیر قال پیدا نہیں ہوتا۔ پھر ایک اور غلط فہمی بھی پھیلائی ہوئی ہے کہ علم نہیں چاہیے عمل چاہیے جبکہ علم تو تصورِ عمل اور عمل کے لئے ہی ہوتا ہے۔ جب علم ہی نہیں ہوگا تو عمل کہاں سے آئے گا؟! اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل چیز تو علم ہے۔ بغیر عمل کے علم ایسا ہے جیسے کسی درخت کے پھل ہی نہ ہوں اور بغیر علم کے عمل ایسے ہی ہے جیسے کسی درخت کی جڑیں ہی نہ ہوں۔ اگر جڑیں تروتازہ ہیں اور پانی بھی دیا جا رہا ہے تو پھل آنے کا کافی امکان ہے۔ امیدوارِ رحمتِ حق رہیں، بیس سال بعد اچانک عمل کے پھل آجاتے ہیں۔ اور اگر جڑیں ہی نہ ہوں تو پھل آنے کا کوئی سوال نہیں۔

۲۔ توحید میں انسانی اختیار اور بے اختیاری کی بات پہلے سمجھی جانی چاہیے۔ انسانی اختیار کی دو dimensions ہیں، ایک ہے from this end، یعنی انسان اور کائنات کے مقابل، اور ایک ہے from that end یعنی خدا تعالیٰ کے مقابل۔ From that end تو انسانی اختیار بہت ہی محدود ہے اور from this end انسانی اختیار بہت وسیع ہے۔ مخلوقیت بہرحال محدودیّت ہے لیکن یہ محدودیت جنابِ حق تعالیٰ کے مقابلے میں ہے کیونکہ اُن کے مقابلے میں تو وسیع سے وسیع اختیار بھی صفر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اختیار نامتناہی ہے اور وہ اپنے نامتناہی اختیار میں سے جسے چاہیں جتنا مرضی اختیار عطا فرمائیں۔ لیکن عطا کیا گیا زیادہ سے زیادہ اختیار بھی خدا کے نامتناہی اختیار کے مقابل تو انتہائی کم بلکہ کم سے بھی کم ہوگا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے جسے اختیار عطا کیا، وہ اختیار کسی کم درجہ کے اختیار والے کے اعتبار سے اتنا اونچا، بلند اور وسیع معلوم اور محسوس ہوتا ہے کہ نیچے والے کے لئے وہ انتہائی پراسرار اور ناقابلِ یقین تک بھی قرار پا جائے گا۔ یہ معاملہ اوپر سے نیچے کی طرف چلتا جائے گا، جہاں تک بھی چلتا جائے اور جب تک چلتا جائے۔ پھر جو اختیار دیا، وہ دینا چاہا تو دینا چاہا! اختیار دینے میں اُن کی حکمرانیوں کی حکمتوں اور اُن کی حکمتوں کی حکمرانیوں کا جو نظام تھا، اس کا

جزوی علم بھی جتنا جیسا وہ کسی کو دینا چاہیں تو دیں، نہ دینا چاہیں تو نہ دیں۔ وہ اگر اختیار دینا چاہیں تو کوئی ان کا ہاتھ نہیں روک سکتا اور اگر وہ اختیار نہ دینا چاہیں تو کوئی انہیں مجبور نہیں کر سکتا۔ اُن پر کسی کا کوئی زور اور دباؤ نہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ اگر وہ کسی کو اختیار دینا چاہیں تو نہ لینے کا اختیار بھی کسی کے پاس نہیں، اور اگر نہ دینا چاہیں تو لینے کا اختیار بھی کسی کے پاس نہیں۔ اختیار علم کی سطح پر بھی دیا جاتا ہے اور عمل کی سطح پر بھی۔ اختیار دے کر اگر وہ دیے رکھیں، تو دیے رکھیں، اور اگر چھین لیں، تو چھین لیں۔ ویسے جس وقت اختیار دیے رکھنا چل رہا ہو، چھین لئے جانا تو ساتھ ہی لگا ہوا ہے۔ اگر اختیار لئے ہوئے ہونے کے دوران یہ غلط فہمی یا خوش فہمی ہو جائے کہ یہ اختیار اس کی اپنی ملکیّت ہے یا یہ کہ اب خدا تعالیٰ واپس لینے کے اختیار سے علیحدہ ہو گئے تو پھر اُس اختیار ملنے سے پہلے کی بے اختیاری سے بھی بات بہت نیچے خدا لے جائیں تو لے جائیں۔ اگر معاف کرنا چاہیں تو معاف فرما دیں۔ سب ان کے اختیار میں ہے۔ چنانچہ کسی کو بھی علم و عمل کا جتنا جیسا بھی اختیار دیا گیا، وہ خدا تعالیٰ کے اعتبار سے تو کم سے بھی کم، لیکن اس شخص سے نچلے درجے کے اعتبار سے وہ اختیار انتہائی بلند اور انتہائی وسیع ہے۔ لوگوں کو با اختیار کرنے کا اختیار بھی جنابِ حق تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اس ساری بات سے اصل میں خدا تعالیٰ کے اختیار کی لامتناہیت ثابت ہوتی ہے۔ انسانوں کو اختیار نہ ملنے سے ہی لفظِ اختیارِ ربّانی کی حقیقت نہیں کھلتی بلکہ انسانوں کو با اختیار کرنے سے بھی اختیارِ ربّانی کی حقیقت منکشف ہوتی ہے! اگر اختیار نہ دینا ہی صرف قبضۂ قدرت میں ہو اور اختیار دینا نہ ہو تو پھر اختیارِ ربّانی کو مکمل کیسے سمجھا جا سکتا ہے؟!

۳۔ غیرِ حق اپنی ذات کے اعتبار سے فقیرِ مطلق ہے۔ حقیقتِ حق ہے غنئِ مطلق ہونا اور حقیقتِ خلق ہے فقیرِ مطلق ہونا! پھر بطور امین مادی، اور روحانی انگنت نعمتوں سے سرفرازی بھی ہے۔ فقیر جب اپنے فقر کا اعلیٰ سطح کا اقرار کرتا ہے اسے دیکھ کر اسے امین بنانے کا شرف بھی جنابِ غنئِ مطلق عطا فرماتے ہیں اور اتنا اور ایسا اختیار عطا فرماتے ہیں کہ دیکھنے والوں کو اس میں غنئِ مطلق نظر آنے لگتا ہے۔ جب وہ شخص خیانت کاری نہیں کرتا تو اسے جنابِ حق تعالیٰ ولائت سے سرفراز فرماتے

ہیں یعنی اللہ تعالیٰ اس کے ولی ہو جاتے ہیں۔ ولائت تب عطا کی جاتی ہے جب ظاہری اور باطنی سطح پر خیانت نہیں کی جاتی۔ مقامِ ولائت غیرِ نبی کے لئے قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ اور جب ولائت محکم ہو گئی اور وجود سراپا شکر ہو گیا تو پھر اسے خلافت عطا کی جاتی ہے۔ یہ potentiality ہر ایک میں رکھ دی گئی ہے۔ اب جو بھی اس potentiality کو actualise کر لے۔

اب یہ مجالِ آبلہ پائی کی بات ہے
ہے جادۂ دیارِ حبیباں کھلا ہوا

۴۔ Secularism اور جدید فلسفہ اب مکمل طور پر مراتبِ وجود اور تنزلاتِ ستّہ اور Unity and Multiplicity کی interrelationing کا تصور کھو چکی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ The Reality کو Ontology میں reduce کر لیا گیا ہے پھر اس Ontology میں بھی اتنی narrownisation and shallownisation کر لی گئی ہے کہ اب Ontology بھی فلسفۂ قدیم والی Ontology نہیں رہی۔ اب scales and grades کا فرق بھول گئے ہیں جبکہ فرقِ مراتب تو بنیادی نوعیت کی چیز تھی کیونکہ اصل لفظ ہی یہی ہے۔ مراتبِ وجود یعنی تنزّلاتِ ستّہ میں Unity Principle کی بحث کلیدی اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن جدید دانشور طبقے کے ذہن میں جیسے ہی Multiplicity کا لفظ آتا ہے سمجھتے ہیں کہ اب Unity گئی۔ اس حقیقت تک تو ان کی رسائی کہاں کہ الکُل فی الکُل۔ اور اس اصول کو جدید عقل سمجھ ہی نہیں پاتی کہ

Unity mirrors multiplicity.

Multiplicity mirrors Unity.

ان کی عقل وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کے ادراک سے قاصر ہے۔ مراتبِ وجود اور فرقِ مراتبِ وجود کا اصول خراب کر دیا گیا ہے۔ لفظِ اصول کی جگہ لفظِ نظریہ آ گیا اور نظریہ بازی سے اصول، حقیقت، سچائی کو خراب کر دیا گیا۔ بحث جو بھی ہو، چاہے باخدا یا بے خدا ہونے کی، مادی

روحانی حقائق کی یا غیب وشہود کی، بات تو در حقیقت اصول، سچائی اور حقیقت کا تعیُن ہے۔لفظِ حقیقت کی جگہ جو بھی لفظ لکھا بولا جائے لیکن بحث تو حقیقت کو decide کرنے کی ہے۔مخالفت یا حق میں دلائل کی بات تو بعد میں ہوگی، پہلے چیز یا حقیقت کا تعیّن ہو لے گا پھر باقی مباحث کی باری آئے گی یعنی وہ چیز کیا ہے جس کے حق میں یا مخالفت میں دلائل لانے ہیں۔کل جھگڑا یہ ہے۔تمام مباحث کا مدارِ کار یہ ہے۔اس کے بغیر ہر بحث ایک بے نتیجہ بحث رہے گی۔

دوسری بحث یہ ہے کہ اس اصول کے تعیّن اور اس کے حق میں دلائل لانے میں source of knowledge کیا ہوگا؟ یعنی Epistemology بحث میں آ کے رہے گی۔ پھر یہ کہ Ontology کا فیصلہ Epistemology کے تابع رہے گا یا vice versa ؟ جو بھی فیصلہ ہو کیا وہ آزاد فیصلہ ہوگا؟ Ontology کے دائرے کا تعیّن بھی کرنا پڑے گا۔ جدید فلسفہ میں Ontology کا جو تصور ہے، کیا Truth اس میں reduce ہو گیا؟ اس میں بھی Epistemology تو لگے گی۔ اہم ترین بات تو یہی ہے کہ Ontology سے Epistemology طے ہوگی یا Epistemology سے Ontology؟ علم کے دائرے کا تعیّن اور پھر وجود اور حدودِ وجود کا تعین یہ دونوں لازمی امر ہیں۔ان سب سے پہلے لفظِ تعین کی definition بھی کرنا ہوگی۔جدید فلسفہ اور دانشور پہلے ان باتوں کا جواب تو دیں۔

یہ ساری بات لفظِ اللہ کے فیصلے کی ہے۔تصورِ اللہ کا فیصلہ! معنیٔ اللہ کی دریافت اور دریافت کی جدوجہد اور پھر اس حقیقت کا انکشاف! ہم Epistemology کی جگہ لفظِ انکشاف لگا لیں۔ اگر Epistemology انکشاف کا ایک جزو بنے تو بات طے ہو جائے گی۔جس پر حقیقت منکشف نہیں ہوتی وہ بات کو Epistemology میں reduce کرے گا جس سے مزید narrownisation ہو کے رہے گی۔

سرّی علوم پہلے صرف خواص کو دیے جاتے تھے اور اُن علوم کا ابلاغ through language of symbols کیا جاتا تھا۔اب Philosophy میں سے language of symbols کو minus کر دیا گیا ہے یعنی جدید فلسفہ reduction into reduction کا مریض ہے۔

قدیم فلسفہ کا موضوع انکشاف تھا یعنی ایک ایسی بات جو کہ meta-words تھی لیکن اس کا ابلاغ ممکن تھا۔ وہ بات نہ صرف meta-words تھی بلکہ meta-ideas بھی تھی، اس حقیقت کی grasping سرّی علوم کے حلقہ میں ہوتی تھی۔ تب حقیقت سے ربط و تعلق تھا۔ حقیقت کا آدمی سے اور آدمی کا حقیقت سے! میرا خدا سے اور خدا کا مجھ سے! یہ ربط و تعلق قلب میں منتقل کر دیا جاتا تھا۔ یہ کام مکالمے سے بھی کیا گیا اور خامشی سے بھی۔ لیکن اس کے لئے اعمال اختیار کئے گئے اور ریاضتیں کی گئیں تب یہ کام ممکن ہوا۔ قلب سے قلب میں بات منتقل کی جاتی تھی اور منتقل ہوتی تھی۔ لیکن اب فلسفہ سوائے وسوسہ کے اور کیا ہے!

۵۔ حقیقت اور علمِ حقیقت پہلے سے انسانی وجود میں ہے۔ اب جو پہلے دیکھا تھا، اس کے مطابق انسانی وجود کے اندر اور باہر نشانیاں بتا دی گئیں جو آدمی کو اس مقام تک لے جائیں گی کہ جہاں حقیقت سے آمنا سامنا ہو جائے گا۔ انسانی فطرت یا فطری استعداد اسی چیز کا نام ہے کہ نشانیاں ہر انسانی وجود میں رکھ دی گئ ہیں۔ اس فطری استعداد کے برباد اور فاسد کر دیے جانے کا نام ہے ختم اللہ علیٰ قُلوبھم ۔ یہ مدفونیّت ہے یعنی دفن کر دیا جو کچھ کہ عطا کیا گیا تھا اور اب کھدائی بھی ممکن نہیں۔ طالبِ حق کی فطری استعداد اس ناقہ گم گشتہ یعنی ذاتِ حق کو دیوانہ وار ڈھونڈھ رہی ہے، اس لئے انسان ہر ایک سے پوچھتا ہے۔ فطری استعداد کو unreal دیکھ کر تسلی نہیں ہوتی کیونکہ وہ حقیقت کو بارہا دیکھ چکی ہے یعنی حقیقت اور علمِ حقیقت دونوں اس کے ساتھ رہے ہیں۔

وجودِ حق یا آمیزشِ حق کے بغیر باطل کا ظہور ممکن نہیں! جس نے جو بھی definition of reality قبول کی اُسے حقیقی سمجھ کر ہی قبول کیا، غیر حقیقی یا جھوٹ سمجھ کر قبول نہیں کیا۔ تو ہر ایک طالبِ حقیقت ہے، البتہ اسے باطل پر حق کا گمان ہو گیا اور اس گمان کو علم و تحقیق بھی سمجھتا تھا ورنہ باطل کو کوئی قبول ہی نہیں کر سکتا۔ فطری استعداد تو طالبِ حق ہے، وہ غیرِ حق کو کبھی بھی غیرِ حق سمجھ کر قبول نہیں کرتی۔ اگر قبول کردہ باطل میں حق کی آمیزش نہ ہوتی تو کسی نے کسی قیمت پر اسے قبول ہی نہ کیا ہوتا۔ باطل میں حق کی آمیزش تھی تو اس پر حق کا گمان گزرا ورنہ جعلی اصلی لگ نہیں سکتا تھا اور پھر خود اربابِ باطل بھی اسے

قبول نہ کرتے۔ یہ بات حقیقت ہے کہ falsehood میں اگر truth شامل نہ ہوتو اسے truth کہنے والے اسے truth کبھی نہ کہہ رہے ہوتے۔ سوال تو truth اور non-truth کا ہے، falsehood کا نہیں! جو non-truth ہوتا ہے اس میں بھی real شامل ہوتا ہے چاہے جتنے فیصد ہو لیکن وہ اتنی مقدار میں ضرور ہوگا کہ جس سے اس کے truth ہونے کا دھوکہ ہونا تھا۔ باطل کو حق سمجھ کر ہی قبول کیا گیا ہے۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ حق ہے! اب چاہے کوئی حق کا انکار کرے یا اقرار کرے، لیکن انکار واقرار کی شکل کیا ہے؟! قبولِ باطل وجودِ حق کی دلیل ہے!! کیونکہ باطل میں بھی حق شامل ہے جو اسے حق سمجھ کر تسلیم کرلیا گیا۔ اس لئے بڑے سے بڑا secular بھی اپنے آپ کو طالبِ حق ہونے سے سو فیصد خارج نہیں کرسکتا۔ ختمَ اللہ علی قلوبھم یہ ہے کہ آمیزش والا خود کو بے آمیزش سمجھنے کی سطح پر پہنچ گیا۔ وہ حق حق ہی کیسے ہوگا کہ اس کے ہوئے بغیر کوئی غیرِ حق کو قبول کرلے!! اگر ایسا ہوتو وہ حق ہی نہیں! کھوٹے سکّے تو سچے سکّے ہونے کے نام پر چل رہے ہیں۔ اگر سچے سکے نہ ہوں تو کھوٹے کسی قیمت پر چل نہیں سکتے۔ Secularism میں بھی truth ہے چاہے اس کی مقدار bare minimum ہے لیکن موجود ضرور ہے کیونکہ حق کی موجودگی کے بغیر اسے کوئی قبول نہیں کرسکتا۔ نقلی نوٹ (currency) اصلی سے بہت مماثلت رکھتے ہیں۔ کوئی جعلی نوٹ ایسا نہیں ہوتا کہ وہ اصلی کے غیر مماثل ہو۔ باطل جو ہے وہ حق کے parallel نہیں۔ سارتر کا مؤقف جناب امام غزالیؒ کے ساتھ چل رہا ہے تو کچھ اس میں غزالی کی مماثلت ہوگی تبھی تو چل رہا ہے۔ اصولِ باطل، اصولِ حق میں چُھپ کر current currency کے طور پر چلتے ہیں، تو جعلی کی موجودگی اصلی کے موجود ہونے کی اصل دلیل ہے۔ باطل پر حق ہونے کا گمان ہوجاتا ہے چنانچہ حق نہ ہوتو باطل ہو ہی نہیں سکتا۔ باطل نامی چیز اب بھی درحقیقت موجود نہیں۔ ایک خالص اصل ہے اور ایک کسی چیز کے خالص ہونے کا دھوکہ۔ جب آمیزش ہے تو پھر باطل تو ہے ہی نہیں۔ مکمل الحاد میں بھی حق کی مماثلت یا آمیزش ہے۔ اور آمیزش کے بغیر مماثلت ممکن نہیں۔ کھرا سکّہ پہلے موجود ہوتا ہے اسی لئے کھوٹے سکّے بنائے جاتے ہیں چنانچہ کھوٹے سکّے اس بات کی دلیل ہیں کہ کھرے سکّے موجود ہیں۔ اگر کھرے کا وجود نہ ہوتو دھوکا کیسا؟! جب حق ہو ہی نہیں تو کیسا باطل اور کہاں کا باطل؟! کھرا سکّہ اپنی

گواہی خود دے رہا ہے اور کھوٹا سکّہ اپنی نہیں بلکہ کھرے سکّے کے کھرے ہونے کا اقرار کر رہا ہے۔ خدا کے سوا کہیں کچھ موجود نہیں!

ہر چند تیری سمت سوا راہ ہی نہیں
تِس پر بھی آہ یاں کوئی آگاہ ہی نہیں

جھوٹ تو خود سچ کا طلبگار ہے۔ زہر کو مٹھائی میں ملا کر کھلایا جا سکتا ہے لیکن زہر کو زہر کہہ کر کسی کو نہیں کھلایا جا سکتا۔ اربابِ باطل بھی درحقیقت طالبِ حق ہیں کیونکہ آدمی طلبگار تو اصل کا ہے۔ سب اربابِ حق ہیں! کوئی اربابِ باطل نہیں!

مدرسہ یا دیر تھا ، کعبہ یا بت خانہ تھا
سب وہاں مہمان تھے اک تو ہی صاحب خانہ تھا

دنیا میں حق سے متعلق جو بھی آراء ہیں اگر ان میں سچائی نہ ہو تو وہ دنیا میں موجود نہیں رہ سکتیں۔ ان کا موجود رہنا ہی اس بات کی دلیل ہے۔ سچائی کو جھوٹ میں، حق کو غیرِ حق میں چھپایا گیا ہے، لیکن چھپائے جانے کے معنی یہ نہیں کہ حق موجود ہی نہیں بلکہ روح کی تخلیقی جدوجہد کے اظہار کے لئے ایسا کیا گیا۔ تخلیقی تلاش روح کا کام ہے! اگر حق کو غیرِ حق میں پنہاں نہ رکھا جاتا تو کیا روح کو بیکار رکھتے ؟! حق کو غیرِ حق میں mix up اسی لئے کیا گیا کہ یہ بات پوری قوت سے واضح ہو جائے کہ حق کو پہچاننے والی آنکھ بھی موجود ہے اور یہ بھی establish کرنا تھا کہ کس نے آنکھ سے کام لیا اور کس نے بیکار رکھا۔ قوتِ ممیّزہ یعنی خیر و شر کی پہچان کی قوت عطا کی گئ ہے۔ اب اگر اختلاط، مماثلت اور مشابہت نہ ہو تو اس عظیم قوت کا جواز ہی کیا ہے؟ اس لئے تخلیقِ خلط ہوا ہے۔ یہ دنیا التِباس کی دنیا ہے، بے انتہا مشابہت ہے حق اور غیرِ حق میں۔ بازار میں artificial jewelry بِک رہی ہے اور بیچنے والے اسے نقلی کہہ کر ہے بیچ رہے ہیں لیکن خریدنے والے کا مقصد کیا ہے؟ یہ سوچنے کی بات ہے۔ خریدار نے تو البتہ دوسروں پر اس نقلی کو اصلی ہی ثابت کرنا ہوتا ہے۔ ویسے نقلی زیورات اصلی سے زیادہ خوبصورت دِکھتے ہیں۔ عین اسی طرح artificial اور imitated نظریے اور تصوارات بھی ہوتے ہیں اور real اُن کی طرح کا خوبصورت نہیں نظر آتا کیونکہ حق میں تکلف اور تصنّع نہیں ہوتا بلکہ ایک

سادگی اور سچائی ہوتی ہے۔

خالص شے کوئی خریدے نہ خریدے، خالص شے تو خالص ہی رہے گی۔حق کو کوئی مانے یا نہ مانے، حق اس سے قطعی بھی متاثر نہیں ہوتا! حق کو طلبگار کی ضرورت نہیں اور طلبگار بہر حال حق کا محتاج ہے۔حق کو طلبگار کی ضرورت تو کیا، پرواہ بھی نہیں ہے! جھوٹ اگر چلا تو سچ کے نام پر ہی چلا، اُس پر بھی سچ کا احسان ہے۔حق واحد ہے، یہ ہرگز نہیں کہ ایک موسوی حق، ایک عیسوی حق اور ایک محمدی حق۔وحی والا جب ایک ہے تو وحی والے کی بات بھی ایک ہے۔وہ تو جنابِ الھادی ہیں، الحق ہیں، اور دوسرے سب اُن کے پیمبر ہیں۔پیام واحد ہے اور جس کا پیام ہے وہ تو پہلے ہی واحد ہے۔جنابِ الھـــادی نے روح میں شناختِ حق کی طاقت ودیعت فرمائی تو پھر اختلاط تو کیا جانا تھا! جب نفس اور شیطان پیدا فرمائے ہیں تو انہیں بھی بیکار تو نہیں رکھنا تھا۔اختلاط کا جواز قوتِ ممیزہ کی تخلیقی جدوجہد کا مسئلہ ہے۔سچائی اور معنی کی آمیزش کے بغیر جھوٹ چل نہیں سکتا۔جھوٹ کو سچ سمجھ کر ہی اختیار کیا گیا ہے ورنہ جھوٹ کو جھوٹ سمجھ کر کس نے اختیار کیا! ہر جھوٹ حق نُما ہوتا ہے۔باطل کو باطل کے نام پر کوئی چلا نہیں سکتا۔کفر اور معصیّت کی تعریف کے اشعار جو صوفیاءِ کرامؒ نے تحریر فرمائے، وہ اسی تناظر میں پڑھے سمجھے جائیں گے۔

۶۔ جمیع غیوب میں ایک غیبِ اضافی (relative) ہوتا ہے اور ایک غیبِ مطلق (absolute) یعنی ایک غیب ایسا ہے جو ہر ایک کے لئے غیب ہے اور ایک غیب ایسا جو عوام کے لئے تو غیب ہے لیکن اولیاءِ کرامؒ کے لئے شہود۔پھر وہ غیوب جو غیرِ نبی کے لئے غیوب لیکن انبیاءِ کرامؑ کے لئے شہود۔پھر ایسے غیوب جو کسی ایک نبی کے غیوب لیکن کسی اور نبی کے لئے شہود۔پھر آپ ﷺ کے وہ علوم جو صرف آپ ﷺ کے لئے شہود ہیں اور باقی تمام انبیاءِ کرامؑ کے لئے غیوب۔ایک ایسی حد آئے گی کہ جہاں غیبِ مطلق ہوگا کہ جس کا علم فقط اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہے اور کسی کو نہیں۔خدا تعالیٰ کی ذات خود کیا ہے یا کسی شے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا وہ علم جو وہ کسی کو نہ دینا چاہیں تو وہ آخر تک غیب رہے گا۔یہاں بے علمی اور بے چارگی ہے۔

۷۔ اپنی بے علمی بے چارگی کا علم سب سے بڑا علم ہے۔ بے سمجھی کی سمجھ سب سے بڑی سمجھ ہے۔ جسے یہ علم حاصل نہیں اُسے تو الف ب بھی نہیں آتی۔ قرآنِ کریم ایک مکمل وحی ہے لیکن اس کے معنی یہ سمجھنا کہ قرآنِ کریم میں جنابِ علیمِ مطلق کے سارے علوم موجود ہیں تو کوئی نادان ہی ایسا سمجھ سکتا ہے۔ قرآنِ کریم میں وہی بتایا گیا ہے جس پر انسانی فلاح کا دارومدار ہے لیکن ساتھ یہ بھی ہے کہ قرآنِ کریم کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ وہ تو کلامِ الٰہی ہے، ایک پتّے کے کُل عجائبات کُھل جائیں، نہیں جناب، یہ نہیں ہوگا!

۸۔ Epistemology میں پہلا سوال تو knowledge beyond horizons کا ہے۔ سب سے پہلے اس بات کا علم حاصل ہونا چاہیے کہ لفظِ ماورائیت کہاں پہ آئے گا کہ جہاں حصولِ علم ناممکن ہے۔ پھر یہ کہ کس کے لئے کون سا علم ممکن اور کس کے لئے وہ ناممکن ہے۔ اب تو اس اہم ترین بات کو generalize کر لیا جاتا ہے جو کہ دورِ جدید کی بیشتر خرابیوں کی جڑ ہے۔ جو علم کسی ایک کے لئے ناممکن ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ سبھی کے لئے ناممکن ہے۔ اس جہل کو سب سے پہلے ختم کرنا ہوگا کہ جو میرے علم میں نہیں آ سکتا وہ ہر ایک کے دائرۂ علم سے باہر ہے۔ ایک شخص کسی مقام سے ہو کر آ کے بتا رہا ہے جہاں میں نہیں جا سکتا، اب اگر میں اس کی بات نہ مانوں تو درحقیقت میں جاننے کی خواہش ہی نہیں رکھتا۔ اگر جاننا چاہتا ہوتا تو انکار نہ کرتا۔ پھر یہ کہ کسی مقام سے ہو کر آنے والوں کو تو اختلاف کا حق ہے لیکن جو کبھی گیا ہی نہ ہو اسے اختلاف کا کیا حق؟! اسے تو بولنے کا حق بھی نہیں کجا یہ کہ اختلاف کا حق حاصل ہو۔ کوہِ صفا پہ یہی Theory of Knowledge واضح کی گئی۔ سیرتِ نبوی کے اس واقعے سے یہ بات بتا دی گئی کہ What is knowledge and how to seek it? اور پھر قرآنِ کریم میں یہ فرما دیا گیا کہ جس نے حیات لینی ہے عقل و دلیل سے حاصل کرے، اور جس نے ہلاک ہونا ہے عقل و دلیل سے ہو یعنی علم حیات ہے اور جہل موت۔ علم و جہل حیات و مرگ کا سوال ہے۔ یہ سوال اتنا اہم ہے۔ پہلی جانکاری تو یہ ہے کہ ہر جانکاری ہر ایک کے لئے نہیں۔ جو علم جس فرد اور جس گروہ کے لئے ہے وہ فقط انہی کے لئے ہے۔ کوئی

علم ایسا نہیں جو ہر ایک کے لئے ہو۔ پہلے یہ جان لیں کہ ہر سمت، دائرے اور سطح کی جانکاری سبھی کے لئے open نہیں۔ ایک وہ جانکاری ہے کہ جس میں سب خلائق مشترک ہیں۔ جس میں ملائک، جِنّ، چرند، پرند وغیرہ سب مساوی ہیں۔ پھر اس کے بعد عدم مُساوات شروع ہو گی۔ نیچے والے دائرے میں تو مساوات ہے لیکن جیسے جیسے اوپر جائیں گے چھانٹی ہوتی جائے گی۔ جیسے ہی سیڑھی نمبر دو آئے گی، عدم مساوات کا اصول لاگو ہو جائے گا، اور چھانٹی ہونا شروع ہو جائے گی جو کہ مسلسل بڑھتی جائے گی۔ ایک مقام پھر ایسا آئے گا کہ جہاں صرف اور صرف آپ ﷺ ہی ہوں گے، باقی تمام مخلوق کے لئے وہ علم ناممکن ہو گا۔ پھر وہ مقام بھی آئے گا کہ جہاں بس جنابِ حق تعالیٰ ہیں، وہاں آپ ﷺ بھی نہیں ہیں۔

۹۔ مذہب اور تصوف کے بعد بندہ اگر purify ہو سکتا ہے تو وہ شاعری کے ذوق سے ہی ہو سکتا ہے۔ موسیقی، مصوری اور مجسمہ سازی میں حلال حرام کی بحث الگ ہے۔ جب مذہب ہاتھ سے گیا تو جو چیز مراقبہ اور ذکر سے حاصل کرنا تھی، روی شنکر کے سِتار سے روح وہاں تک پہنچ جائے گی۔ پھر ایک ستار ہے، یعنی ساز، اور ایک ہے لحن۔ ان میں بھی سارے انسانی وجود کی melting ہو جاتی ہے۔ فنونِ لطیفہ ایک تخلیقی قوت ہیں۔ اسلام نے کئی چیزیں اس وجہ سے حرام قرار نہیں دیں کہ وہ totally غلط تھیں بلکہ کئی ایسی بھی ہیں کہ ننانوے پوائنٹس تو مثبت تھے لیکن ایک منفی پوائنٹ کی وجہ سے اسے حرام قرار دے دیا گیا۔ اور بحث تو اس ایک پوائنٹ کی ہے۔ وہ ایک point سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیتا ہے۔ ایک چنگاری ہزاروں من گندم کو جلا کے راکھ کر جاتی ہے۔ ہم چنگاری کو اہمیت نہیں دیتے لیکن اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو تو اس چنگاری کا علم ہے، اسی لئے تو روک دیا جاتا ہے۔ سب سے اہم بات موسیقی کے حوالے سے یہ ہے کہ اگر جمال و کمال اور شعورِ جمال و کمال دونوں کی پانچ کروڑ سیڑھیاں ہیں اور موسیقی سے چار کروڑ طے ہو جاتی ہیں، لیکن جو سیڑھیاں رہ گئی ہیں ان تک پہنچنا ہمیشہ کے لئے ناممکن ہو گیا۔ اور چار کروڑ کے بعد ایک سیڑھی کا next سیڑھی سے فاصلہ پچاس کروڑ میل ہے یعنی اگر وہ فاصلہ طے کر لیا گیا تو بلندی بھی بہت زیادہ عطا کی جائے گی۔ سوال تو پہلی

چار کروڑ کا نہیں بلکہ اس کے بعد والی بلندیوں کا ہے، اور موسیقی سے ان بلندیوں تک رسائی کا خانہ ختم ہو جاتا ہے۔ موسیقی سے تہذیبِ ذات تو ہو جاتی ہے لیکن ساتھ ہی ذاتِ حق کی معرفت ہاتھ سے جاتی رہتی ہے۔

۱۰۔ اکثر لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے فلاں طرح کیوں نہیں کیا یا جو ہم چاہتے تھے اس طرح نہ کرنے میں کیا logic ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انسان مجبور ہے اور تقدیر ایک جبر ہے۔ جب اللہ نے ہی سب کیا ہے اور ہمیں بتایا بھی نہیں، تو ہم جان کیسے سکتے ہیں؟ اصل جواب تو یہی ہونا چاہیے کہ ماننا ہے تو مان، نہیں ماننا تو نہ مان۔ ہونا تو اسی طرح ہے جس طرح خدا تعالیٰ چاہیں گے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ سوال کی بھی کوئی حد ہے! سوال، سوال، سوال! آخر کب تک؟! اب لفظِ infinity سوال کے ساتھ لگا لیا گیا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ خلق کے معنی ہیں حد بندی اور تحدید۔ جب تحدید ہے تو why and how کہاں تک؟! ہر وقت تقدیر کا رونا روتے رہنے کے کیا معنی؟! سیرتِ نبوی ہمارے سامنے ہے۔ غزوۂ احد کی شکست اور اس سے بھی پہلے طائف کی سنگ باری اور مکّہ کی گلیوں میں آپ ﷺ پر کوڑے کے ٹوکرے پھینکے جانا ہے، اور یہ سب ان نور کے ساتھ ہے جو کہ تخلیقِ اوّل ہیں۔ اب ہم اپنی دعا اور ذکر اذکار کی بات کرتے ہیں کہ ہم اتنے نیک ہیں پر پھر بھی مصائب میں گھرے ہوئے ہیں۔ مطلب کہنے کا یہ ہوتا ہے جیسے اب انہیں خدائی مل جانی چاہیے۔ Down to earth کچھ حقائق ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ قطب غوث کو اگر سانپ کاٹ لے تو ننانوے فیصد امکان ہے کہ death ہو جائے گی۔ اور اگر کوئی یہ سمجھے کہ قطب غوث کو کچھ نہیں ہوگا تو اس سوچ کا میں کیا کر سکتا ہوں۔ آپ ﷺ کو زہریلے بکرے کا گوشت کھلایا گیا، جب دو بوٹیاں تناول فرما لیں تب حضرت جبرئیلؑ نے آگاہ فرمایا کہ گوشت زہریلا ہے۔ آپ ﷺ کے وصال کا ایک طبعی سبب یہ بھی تھا جو احادیثِ مبارکہ میں آیا ہے۔ اب میرا سوال یہ ہے کہ نور کو سنکھیا یعنی poison کیا کہے گا؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ جنابِ حق تعالیٰ نے اگر جبرئیلؑ کو بھیجنا ہی تھا تو گوشت کھانے سے پہلے بھیج دیں، تو پھر بھیجا کیوں نہیں؟ جواب یہی ہے کہ اللہ کریم کا اپنا ہے سب کچھ۔ ان

کی حکمرانیوں کی حکمتوں اور حکمتوں کی حکمرانیوں کا نظام ہے۔ انسان کا کام جنابِ حق تعالیٰ کو dictation دینا نہیں۔Faith کے معنی ہیں کہ to stop telling God what to do یعنی اللہ کو خدائی کے طریقے بتانا چھوڑ دیں۔انبیاءِ کرامؑ کی دعائیں پڑھ لیں جو قرآنِ کریم میں موجود ہیں اور آپ ﷺ کی دعائیں بھی پڑھ لیں جو کُتبِ حدیث میں موجود ہیں، جو معارف وعلوم ان دعاؤں میں ہیں وہ کہیں اور نہیں۔ جو بھید، اسرار ان میں ہیں وہ بس انہی دعاؤں میں ہیں، اور بلند ترین بھید ہے عجزِ کامل اور عبدیّتِ کامل۔خود سپردگی، خود حوالگی اور نمانا پن! یعنی دعویٰ بندے میں سے نکل جائے۔ میں تو قرآن وحدیث کے معنی ترکِ دعویٰ سمجھا ہوں۔بس اپنے احتیاج اور اُن کے غناء کا شعور رہے۔Human is altogether human اس بات کو کبھی نہ بھولیں۔ Godhead کے Godhead ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ لفظِ guarantee تو صرف جنابِ حق تعالیٰ کے ساتھ ہے۔وہ جدھر کرم کرنا چاہیں ان کی مرضی۔

۱۱۔ لوگ اپنے ذوق، اپنی عقل اور اپنے شیخ کا جو specific structure ہوتا ہے، قرآن وحدیث کے مطالب ومعانی کو اسی میں fit کرتے ہیں یعنی قرآن وحدیث کو اپنے ذاتی فکر وفہم میں ڈھالتے ہیں۔دین کی دو اقسام ہیں:

۱۔قرآنی وحدیثی ذوق کا دین

۲۔ذاتی ذوق ومزاج کا دین

حضرتِ والاؒ نے ایک بار فرمایا کہ صُبا صاحب، آخری درجے میں انسان اپنا ہی معتقد رہتا ہے ناں!' سوال تو نگاہِ ربانی اور نگاہِ رسول کا ہے، اور اس کا علم قرآن وحدیث سے حاصل ہوگا۔لیکن اس میں ایک باریک بات یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں جو کہا گیا، کیا ہماری عقل وفہم نے اسے بالکل صحیح سمجھا؟ یہ تو سمجھنے والے کا فیصلہ ہے ناں کہ میں نے بالکل صحیح سمجھا کہ آیت میں یہی فیصلہ تھا جسے میری عقل سمجھ گئی۔ ورنہ کوئی وحی تو نازل نہیں ہوئی کہ جو ہم سمجھے ہیں عین وہی تھا جو کہ قرآن وحدیث میں بیان کیا گیا۔لیکن چودہ سو سال میں جن مطالبِ قرآنی پر علماءِ کرامؒ کا اتفاقِ رائے ہے وہ مستند مطالب و

معانی ہیں، ان پہ یہ اصول نہ لگائیں، ان پر یہ غیر مقلدانہ سوچ apply نہ کریں۔ ہاں اُن معانی کو تمام معانی سمجھنا غلط ہے چاہے ان مطالب و معانی پر سبھی متفق ہیں، اور نہ انہیں وحی کا درجہ دینا ہے کیونکہ بالآخر وہ انسانی عقل ہی کا سمجھا ہوا ہے۔

۱۲۔ قرآن پاک میں جہاں معجزے کا ذکر آیا ہے وہاں لفظِ آیت ہی استعمال کیا گیا ہے اور کچھ احادیثِ مبارکہ میں لفظِ علامت آیا ہے۔ پھر یہ فرمایا گیا کہ انفس و آفاق میں نشانیاں رکھ دی گئیں۔ دھواں اُٹھتا دیکھ کر کہیں گے کہ آگ لگی ہوئی ہے تو دھواں نشانی ہے آگ لگے ہوئے ہونے کی۔ دھواں نکلتا دیکھ کر ایک یقینی نتیجہ نکال لیا۔ اب یہ کوئی induction ہے؟ اکثر علماءِ کرامؒ نے آگ اور دھویں کی تمثیل سے بات سمجھائی ہے لیکن صوفیاء کرامؒ کا یہ طریقہ نہیں رہا۔ جس نے آگ پہلے کبھی دیکھی ہی نہ ہو اس کے لئے تو دھواں کوئی نشانی نہیں۔ Induction, Deduction اُس کے لئے کوئی معنی ہی نہیں رکھتے۔ الست اور بلٰی کا نقطۂ اتّصال پہلے ہے۔ آیت دیکھ کر پورا منظر یاد آ جاتا ہے۔ یاد ہو گی تو یافت ہو گی! ورنہ عقلی تجربی استدلال سے کیا ہو گا! اگر پہلے سے دیکھا ہوا نہ ہو تو نشانیوں سے پہچان ممکن نہیں۔ خواب میں اگر کسی حسین کو دیکھا لیکن دیکھا مکمل پردے میں اور وہ کہیں کہ ہم ایک روز بے نقاب سامنے آئیں گے اور تم پہچان جاؤ گے۔ خواب دیکھنے والے نے کہا کہ کیوں نہیں، یقیناً پہچان جائیں گے۔ جلوے نے دید کو وہ بینائی عطا کر دی ہے کہ پہچان لیں گے۔ حسن کا تیر ترازو ہے دل میں!

اے کاش! میں حقیقتِ ہستی نہ جانتا
اب لطفِ خواب بھی نہیں احساسِ خواب میں

اب دل میں یہ بات جاگزیں ہے کہ تمام زمینوں اور زمانوں کا حسن تو بس وہی ہیں جنہیں خواب میں دیکھا تھا۔ جمال نے یہ بات ترازو کر دی تھی کہ واحد وہی ہیں۔ جب کسی روز وہ حسین سامنے گزرے گا تو یہ دیوانہ وار بھاگے گا اس کی جانب یا بس وہیں مر جائے گا۔ اور جنہوں نے خواب میں حسن نہیں دیکھا تھا، انہیں کچھ نہیں ہو گا بلکہ جو دیوانہ وار بھاگا ہے اُسے کہیں گے کہ یہ دیوانہ ہے۔ اب بھائی! میں

نہیں جانتا کہ سلاخیں گاڑ دیا جانا کیا ہے! اس عاشق پر تو خواب کا ہی اتنا اثر ہے کہ بھری دنیا میں وہ تنہا ہو گیا۔ ایک خواب تنہا کر گیا! یہ کام دھوئیں بازیوں سے نہیں ہوتا۔ ہاں استدلالی ایمان حاصل ہو جائے گا۔ شرطِ ایمان تو اشدُّ حبًّ للہ ہے۔ ایمان تو ایمان ہی تب ہوگا جب محبتِ شدید ہوگی۔ اگر یہی نہیں ہوا تو ابھی کچھ حاصل نہیں ہوا۔ محبتِ شدید تب ہو سکتی ہے جب دل میں یہ بات راسخ ہو جائے کہ اُن کے سوا کہیں اور حسن ہے ہی نہیں۔ اب مجھ سے حقائقِ محبت پوچھتے ہیں! میں اگر جمالِ کامل ہوں تو کوئی عشقِ کامل بھی تو ہو! جس طرح میں اپنا عاشق ہوں اسی طرح سے کوئی میرے حسن کی پرچھائیں لینے والا بھی تو ہو۔ تخلیقِ عشاق دراصل خود اپنی معشوقی ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ

یُحبّھم و یُحبُّونہ‘ چہ اقرار است
بزیرِ پردہ مگر خویش را خریدار است

ہماری عاشقی کو پردہ کہا ہے۔ بس یہ پردہ چاک کر دو تو سامنے وہی عاشق اور وہی معشوق! دوسرے کا وجود تو کیا تصوّرِ وجود ہی محال ہے۔ کافر ہونا یہ ہے کہ چیز جیب میں ہے لیکن حافظے سے وقتی طور پر محو ہو گئی۔ اور ایمان بالغیب یہ ہے کہ

ہم تجھے جانتے ہیں روزِ ازل سے لیکن
یہ نہیں جانتے کیونکر تجھے ہم جانتے ہیں

۱۳۔ کسی شخص کا الحق کا جو تصوّر رہو، وہی اس کا دین ہوتا ہے۔ خدا کے معنی ہیں The Real, The Truth، اور بے خدا کوئی شخص نہیں۔ اپنے آپ کو non-believer کہنے والا کسی نہ کسی کو The Real کہہ رہا ہوتا ہے۔ اس لئے لاعقیدگی لفظ ہی غلط ہے، کیونکہ خود لاعقیدگی بھی ایک عقیدہ ہے۔ اگر کسی فردِ بشر سے خدا، نبی، جنّت، دوزخ کی بات نہیں ہو سکتی، یعنی اسے اِن کے متعلق communicate نہیں کیا جا سکتا تو پھر یہ تو ممکن ہے کہ یہ دریافت کیا جائے کہ زندگی محدود ہے یا لامحدود؟ Who is The Real? اور جسکو The Real کہہ رہے ہیں اُس کے The Real ہونے کے کیا دلائل ہیں؟ آپ اپنے دلائل کبھی نہ دیں یعنی خود کٹھرے میں نہ

کھڑے ہوں۔جس بات پر یقین ہواس کے بارے میں کوئی آپ سے دلیل نہیں مانگ سکتا۔کئی لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ حقائقِ غیبیہ کے موجود ہونے کے عقلی دلائل کیا ہیں۔پہلی بات تو یہ ہے کہ عقل خود حقیقتِ غیبیہ ہے یا شہود یہ؟ عقل کوئی شے ہے خود اس بات کے کون سے عقلی دلائل ہیں؟ وہ صفات جو میں خدا سے منسوب کر رہا ہوں، سوال کرنے والے عقل کے ساتھ منسوب کئے ہوئے ہیں۔بس اتنی سی بات ہے! اب ہم لوگ نجانے کیوں احساسِ جرم کا شکار ہیں۔اگر اسلام پر فخر ونشاط نہیں تو پھر کچھ نہیں۔اننی من المسلمین یعنی اگر تم سچے اور پکّے مسلمان ہو تو پھر کائنات کی اعلیٰ ترین بلندی کے مالک تم نہیں تو پھر اور کون؟!! اسلام سے تو منہ موڑ کے جانا صرف اسی کے لئے ممکن ہے جو duffer ہو۔اپنے اندر اس طرح کا جذبہ پیدا کریں، خدا کے لئے پیدا کریں۔اگر ناز وغرور نہیں کرنا تھا اور شرمندہ اور دبے دبے رہنا تھا تو اسلام لینا ہی کیوں تھا! لا الہٰ الا اللہ کیا ہے ہمیں ابھی اس کی پہچان نہیں اور پہچان کو ایمان کہتے ہیں، جب پہچان ہوگئی تو پھر اس پہچان سے کام بھی لینا ہے۔جو اللہ کا مُطیع ہوگیا، سارا نظامِ دہر اسکا مُطیع ہوگیا۔اگر کائنات مُطیع نہ ہو تو سمجھ لو کہ تم اللہ کے مُطیع نہیں ہو۔

۱۴۔ وہ ذات جس کی کوئی replacement اور جس کا کوئی alternative نہ ہو، اس کا نام اِلٰہ ہے۔عربی میں اِلٰـــــہ کا لفظ معبُودِ حقیقی اور معبُودِ باطل دونوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔لیکن کوئی معبُود other than معبُودِ حقیقی الٰـہ نہیں۔اللہ کے اسمِ مبارک کے جتنے حروف ہیں اگر باری باری، ایک ایک کر کے مٹاتے جائے تو بھی اسمِ مبارک meaningful رہتا ہے۔دنیا میں ایسا اور کوئی نام نہیں۔ ہر حرف گواہی دے رہا ہے کہ وہ یکتا و یگانہ ذات ہے۔اسی لئے قادری حضرات صرف ھو کا ذکر کرتے ہیں۔

الله لِلّٰہ لَہٗ ہُ

۱۵۔ فقر آخر تک خلق سے منفک (minus) نہیں ہوسکتا۔اللہ تعالیٰ کی اصل غناء ہے اور خلق کی اصل فقر ومحتاجی۔وہ غنیٔ مطلق ہیں تو ان کی مرضی کہ وہ کسی کو جاعل فی الارضِ

خلیفہ بنائیں انَّ الارض ا لامانہ فرمائیں لقد خلقنا الانسان فی احسنِ تقویم یا لقد کرّمنا بنی آدم کریں۔ وہ جس کو جو مرضی اور جتنا مرضی عطا فرمائیں اور وہ عطا فرماتے ہیں۔ انسان کے باطن میں وہ ظہور فرماتے ہیں۔

یہی نقشہ ہے، یہی رنگ ہے، ساماں ہے یہی

یہ جو صورت ہے تِری، صورتِ جاناں ہے یہی

اپنی ذات کے اعتبار سے تو فقر ہی فقر ہے لیکن اگر جنابِ حق تعالیٰ اِسے مجلّٰی آئینہ بنا کر اپنا عکس اس میں دیکھیں تو دیکھیں۔ آئینۂ عینِ ثابتہ میں جتنی وسعتوں کا مالک ہے انہی حدود و قیود میں وہ عکس ہے۔ اسی مقام سے آپ ﷺ فرمائے ہیں کہ ما عرفناك حقَّ معرِفتك کسی کو جو بھی معرفت حاصل ہوتی ہے وہ حدود و قیود میں ہوتی ہے۔ اور جو معرفت حاصل ہو اس کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ 'بس کچھ ہے'۔ ذات کی معرفت غیرِ حق پر حرام ہے۔ فقط جہل در جہل، اندھیرا در اندھیرا! بس ایک تحیّر، ایک حیرت قلب پر آتی ہے اور اُس سے پھر عظمت، ہیبت، اُنس یعنی کچھ احوال ازلی استعداد کے متناسب قلب پر وارد ہوتے ہیں۔ اور حضرت امیر خسروؒ اسی مقامِ حیرت سے فرمائے ہیں کہ

من و شب ہاؤ بیداری و حیرانی و خاموشی

کہ محرم نیست خسرو را زباں در گفتگوئے تو

اللہ تعالیٰ گرتے پڑتے پہنچا دیا کرتے ہیں۔ گرے ہوؤں کو اٹھایا جاتا ہے اور ہائی جمپ لگانے والوں کو گرایا جاتا ہے۔ اپنی بے بسی بے چارگی پہ جو رو دیا، کرم کی ہوائیں اسے اُڑا لے جاتی ہیں اور جسے اپنی برق رفتاریوں کا دعویٰ ہو اس کا تو کچھ نہیں بنتا۔

۱۶۔ مجذوب اگر واقعی مجذوب ہے تو اس کی موجودگی میں شرم وخوف کا غلبہ ہوگا، اپنے گناہوں پر شرمساری ہوگی اور دل دنیا سے خالی ہو جائے گا۔ اور اگر پاگل ہو تو خیالات میں انتشار ہوگا۔ سب سے بڑی گواہی تو خود اپنا وجود ہی ہے۔

۱۷۔ نبی کی معرِفت جیسی خدا کو ہے ویسی خود نبی کو بھی نہیں ہوتی، غیرِ نبی کو تو خیر کیا ہو گی! یہ جو کہا جاتا ہے کہ ولی را ولی می شناسد، یہ غلط بات ہے، کیونکہ کم درجے والا اپنے سے بلند درجے والے کو تو کیا جانے سمجھے گا، برابر والا بھی نہیں جان سمجھ سکتا۔ اصول یہ ہے کہ ولی را نبی می شناسد، نبی را خدا می شناسد۔

۱۸۔ انسان کا انسان ہونا اس بات میں ہے کہ وہ خود کو کس طرح define کرتا ہے۔ Self defining capability انسان کو انسان بنانے والی چیز ہے۔ اپنے اور اپنی ذات کے مفہوم کے فیصلے کی ذمہ داری انسان کے سر ہے اور یہی آزادیٔ انتخاب انسان کے انسان ہونے کی دلیل ہے۔ جس سطح کی آزادی انسان کو دی گئی ہے آزادی کی وہ سطح ملائکہ اور جنّات کو حاصل نہیں۔ انسان کو انسان freedom of choice بناتی ہے۔ فیصلہ انسان کے مرکزِ ادراک میں ہو گا۔ پھر یہ کہ وہ مرکز ایک ہے یا کئی ایک۔ اگر کئی ایک ہیں تو ان کی unification کی بحث ہو گی کیونکہ اگر ہر مرکز، یعنی وجدان، تخیُّل، احساس الگ الگ کام کر رہے ہیں تو ادراک کی وحدت محض ایک خواب ہے۔ اہم ترین چیز تو ادراک ہے۔ ادراک کی پستی سے انسان پست ہو جاتا ہے۔ ادراک کا مطلب ہے ترک و اختیار یعنی کس کو حقیقت اور کس کو فریبِ نظر قرار دیا۔ یعنی ادراک ایک vision رکھے گا۔ انتخاب کی آزادی ادراک سے، اور ادراک کا مطلب نصبُ العین، اور نصبُ العین کا مطلب حقیقتُ الحقائق کس کو قرار دیا ہے۔ بے فیصلہ کوئی نہیں رہ سکتا۔ توحید یا شرک، کس کو اختیار کیا؟ کیا صرف ظہور کو وُجود کہا، یا ظہور اور قبلِ ظہور کو ملا کر حقیقت کہا؟ یعنی حقیقت کسے قرار دیا۔ یہ ذمہ داری انسان کے سر ہے، یعنی ادراک اور ادراک کا فیصلہ۔ آزادیٔ انتخاب ایک ذمہ داری ہے۔ ایک انسان اگرچہ ایک فرد ہوتا ہے لیکن جب وہ فیصلہ کرتا ہے تو انسان کے انسان ہونے کا فیصلہ کرتا ہے، چاہے دوسرے اُس فیصلے کو مانیں یا نہ مانیں۔ ایک مطلق فیصلہ انسان کو انسان بناتا ہے۔ اور یہ ایک sheer responsibility ہے۔ فیصلہ میں نے کرنا ہے اور میرا فیصلہ کسی اور کا فیصلہ نہیں اور کسی اور کا فیصلہ میرا فیصلہ نہیں۔ مزید یہ کہ فیصلہ کرنے میں غیر ذمہ داری کا عنصر نہ ہو کیونکہ فیصلے کے نتائج مجھ پر اور

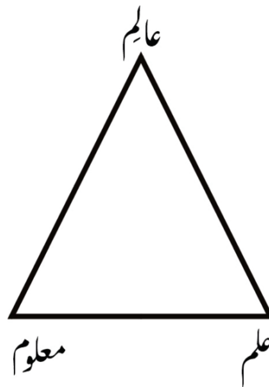
پوری مخلوق پر اثر انداز ہونے ہیں کیونکہ میرے فیصلے کا عمل اور ردِّعمل سب پر ہوگا۔

اپنے جوہرِ وُجود (quintessence) کا فیصلہ انسان کو انسان بناتا ہے یعنی I-ness کے جوہر کی یافت۔ The Real اور The Truth کو decide اور determine کرنا ہے۔ اور اس کے بعد یہ کہ ظاہر اور باطن کے اعمال اُس فیصلے کے مطابق ہیں یا مخالف؟ انسان اپنے جوہر کا جو بھی فیصلہ کرے گا وہ اصل سے مختلف بھی ہوسکتا ہے یعنی جوہر تو تھا مٹی لیکن کہا خود کو آگ۔ اگر حقیقی کو غیر حقیقی کہہ دیا تو اس سے حقیقت چُھپے گی نہیں کیونکہ حقیقت کسی کے اقرار اور انکار سے وراء ہوتی ہے۔

حقیقت کا فیصلہ اس چیز سے ہرگز بھی نہیں ہوگا کہ اکثریّت کس طرف ہے۔ اقلیّت یا اکثریّت سے فیصلہ نہیں ہوگا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ اصل اصل ہی رہے گی چاہے اکثریّت اس کا انکار کردے۔

اصل ذمہ داری حقیقت کو جان لینے کی ہے اور وہ جانکاری درست بھی ہونی چاہیے۔ اگر غیر واقعی کو حقیقی سمجھ لیا یا مفروضے کو صداقتِ کبریٰ قرار دے لیا تو یہ غلط۔ غیر جوہر کو جوہر قرار دینے سے وہ جوہر نہیں ہو سکتا۔ کسی کے خیال میں تو چاہے ہوگا لیکن درحقیقت وہ ایک خیالِ باطل ہی قرار دیا جائے گا۔

اصل لفظ ہے علم۔ حقیقی علم یہ ہے کہ علم جس طرح ہو، چیز عین اسی طرح ہو، چیز جس طرح ہو، علم عین اسی طرح ہو۔ صرف 'جاننے' کو علم نہیں کہتے بلکہ حقیقت میں وہ چیز جس طرح ہو، علم بھی عین اسی طرح ہو، اس طرح کی جانکاری کو علم کہتے ہیں۔ اور یہاں علم اور معلوم کے رابطوں کی بحث آ کے رہے گی۔



اس تکون کا فیصلہ کرنا پڑے گا۔ اپنے جوہرِ وجود کی یافت اور اس تکون کا فیصلہ لازم وملزوم ہیں۔ سوچ

اگر خلافِ حقیقت ہے تو وہ علم نہیں جہل ہے۔ اور پھر ذرائع علمی کی بحث بھی ہوگی کیونکہ مستند ذرائع علمی کو چھوڑ کر فیصلہ کرنے سے فیصلہ غلط ہوگا۔ علم کا حقیقی اور پورا ہونا ضروری ہے کیونکہ اگر کم و بیش ہوا تو وہ علم ہی نہیں یعنی چیز تو صحیح بتائی جائے لیکن اگر placement اور content غلط ہیں تو وہ علم نہیں۔ ?What is Real and Absolute اور ?What is relative ان سوالات کے جوابات کی ذمہ داری انسان کے سر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ

Other than God, nothing is real but relative.

انسان کے مذہب نے انسان کو انسان بنانا ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ فیصلہ جذباتی عقل یا احساس اور محسوسات سے کیا یا دوسروں کے تجربوں کے فیصلوں کے ذریعے فیصلہ کیا؟ ذاتی تجربات نے، وجدان نے یا روح نے، یا ان سبھی نے اکٹھے فیصلہ کیا؟ ان سوالات کا جواب ازحد ضروری ہے۔ جس بلندی کا فیصلہ ہوگا اسی بلندی کا وہ انسان ہوگا۔ یہ فیصلہ کرنا ہے کہ میں کس فیصلے پہ چلوں، یہ فیصلہ کرنے کا اختیار ہے آدمی کے پاس۔ اللہ کی غلامی اگر نہیں تو کسی کی غلامی تو اختیار کرنا پڑے گی، چاہے وہ اپنے ذاتی تجربے کی غلامی ہو۔ ہر انسان بے اختیاری کو اختیار کرتا ہے۔

ہر کس و ناکس کسی کے ہاتھ میں دینا ہے ہاتھ
ہمنشیں پھر بیعتِ جامِ زرافشاں کیوں نہ ہو

۱۹۔ عقل اور دماغ کی حیثیت تو مترجم کی ہے اور قلب و کشف مصنف ہیں۔ اور translation غلط بھی ہو سکتی ہے اور صحیح بھی، دونوں امکانات موجود ہیں۔ ترجمہ اگر مصنف کے پاس بیٹھ کر اس کی زیرِ نگرانی کیا جائے گا تو ٹھیک ہوگا ورنہ غلطی کا امکان بہت زیادہ ہے، اگرچہ ترجمہ تو عقل ہی کرے گی۔ عقل جو ترجمہ کرتی ہے، غلط یا صحیح سے قطعِ نظر، کام کرنے کی قوت تو بہر حال قلب سے آئے گی۔ حواسِ خمسہ بھی جو کام کر رہے ہیں وہ قلب سے دماغ میں آئی ہوئی توانائی کے کچھ حصے سے کر رہے ہیں۔ دماغ ٹرانسفارمر ہے، کوئی بجلی گھر نہیں۔ Heart کا بھیجا ہوا خون خلیوں میں ہوگا تو دماغ کام کرے گا۔ روح جو حیات آفرینی کرتی ہے وہ through heart کرتی ہے۔

نفرتوں اور محبتوں کا مقام تو قلب ہے۔ حاسد، حریص اور کینہ پرور کی عقل اور حافظہ اُس طرح کام نہیں کر سکتے جیسے رذائل سے پاک انسان کے کرتے ہیں۔ حسد اگر دماغ سے ہوتا ہے تو کوئی فلسفی گرفتارِ رذائل نہ ہو۔ حقیقتِ قلبیہ تو عرش سے اُدھر ہے کیونکہ قلب عالمِ اَمر کی چیز ہے۔ اُس قلب کو جو ربط اس جزوِ بدن قلب سے ہے وہ کسی دوسرے جزوِ بدن سے نہیں ہے۔ سلطانُ الذّکر اگر جاری ہو جائے تو پھر قلب والے اُصول بدن کے کسی بھی حصے پہ لگالیں، پھر دیواریں نہیں حائل۔

۲۰۔ انسان کے باہر جو کچھ ہے اُن کی کل صفات انسان کی ذات میں موجود ہیں اگرچہ وہ صفات الگ الگ طور پر اس میں کمزور اور باقی مخلوقات میں طاقتور ہیں۔ شیر کا شیر پن بھی، سانپ کا سانپ پن بھی انسان کے اندر ہے۔ صرف انسان کو ایسا تخلیق کیا گیا ہے ورنہ اور کسی مخلوق میں کسی دوسری مخلوق کی صفات نہیں پائی جاتیں۔ قرآنِ کریم میں فرمایا گیا کہ انسان کو ضعیف پیدا کیا گیا۔ ساروں کی صفات رکھنے کے باوجود ضعیف۔ لیکن اس ضُعف کے باوجود انسان اپنے اندر موجود کمزور قوتوں سے ایک قوت نکالتا ہے یعنی تمام قوتوں کو ایک قوت کر لینا۔ وہ قوت باقی تمام خلائق سے بڑھی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا جو کچھ ہے انسان ان میں سب سے زیادہ پُرقوت ہے۔ قوت نکالنا اس کے فیصلے سے ہوتا ہے۔ جس قوت کا فیصلہ ہوگا اُتنی قوت کا وہ مالک ہوگا۔ ضعف میں بھی انسان سب سے آگے ہے اور طاقت میں بھی۔ غلط کاری میں بھی سب سے آگے ہے اور نیکوکاری میں بھی۔ انسان میں خیر اور شر دونوں کا تصادم ہے اور تصادم ہی حقیقتِ آدم ہے اور جوہرِ انسان ہے۔ اسی وجہ سے انسان بلند مرتبہ ہے۔ بندے کے اندر جو کثرت ہے اس کثرت میں قوتِ نگاہ پھنس کے رہ جاتی ہے۔ کثیرُ النظری کی بدولت انسان ضعیف ہے، مُنقسم ہو جانا انسان کو ضعیف بناتا ہے۔ انسان کے اندر جتنی صفات ہیں ہر ہر صفت کی کوئی نہ کوئی حاجت ہے، حاجت ہوگی تو محتاجی بڑھے گی، اور محتاجی سے ضعف۔ سب سے زیادہ محتاج بھی انسان ہی ہے۔

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے

انسانی ضعف پر نظر کرنی چاہیے اور اس ضعف کو قوت میں بدلنا چاہیے کیونکہ انسان کو ایسی قوت سے نوازا گیا ہے کہ وہ ضعف کو قوت میں بدل سکتا ہے۔ علم کے اعتبار سے انسان تمام مخلوقات سے برتر ہے اور علم ضعف کو قوت میں تبدیل کر لیتا ہے۔ انسان کے پاس تسخیرِ کائنات کی قوت، دعا کی قوت اور تعلق مع اللہ کی قوت ہے، جانوروں کے پاس یہ قوتیں نہیں۔ یہ انسان کا شرف ہے کہ وہ ضعف کو قوتوں میں بدل سکتا ہے۔ ان قوتوں سے عہدہ برآ ہونا ہے۔ Nature اور Man کا encounter ہے شروع سے آخر تک۔ فطرت انسان کو مُسخّر کرنا چاہتی ہے اور مسخر کرنے کی قوت بھی ہے اس کے پاس۔ اگرچہ کئی بار بندے کو شکست بھی ہوئی ہے لیکن انسان کبھی بھاگا نہیں اور اِس نے شکستوں کو فتح میں بدلا ہے۔

مِرے ہی نقوشِ پا سے سج کر
صحرا مرا نام پوچھتا ہے

Beauty of Nature کے مقابلے میں انسان Art لے کر آیا۔ آوازوں کا نظام فطرت میں ہے اور انسان نے اس کے مقابل راگ پیدا کر لئے۔ انسان فطرت سے ہم آہنگ بھی ہوا ہے اور اس کے مقابل آئینہ بھی رکھا۔ فطرت سے نبرد آزمائی بھی کی اور عاشق معشوق بھی۔ عاشقی انسان کے انسان ہونے کا عمل ہے۔ جب فطرت کی عاشقی سے بھی انسان مطمئن نہ ہوا تو اِس finite being نے The Infinite کو اپنانے کی infinite خواہش پیدا کر لی۔ انسان صرف جمالِ مخلوق میں نہیں بلکہ جمالِ خالق میں کھو گیا۔ یہ infinite effort انسان کو انسان بناتی ہے۔ انسان infinite curiosity کا نام ہے۔ لامحدود طلبی! یہی جنون انسان کو انسان بناتا ہے۔

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

انسان کی تمام کوششیں تمام تر expeditions جستجوئے جمال ہی کی صورتیں ہیں۔ External Adeventure کا نام ہے Science اور Adventure Within کا نام ہے Religion یعنی انسان کا اپنے باطن میں سفر۔ انہی adventures سے انسان حقیقت کے

معانی متعین کرتا ہے۔

Adventure is man. To be an adventurer is to be a man. Life creates life and life conquers death. Conquering death is life. Adventure in relation with nature is science, in relation with beings is sociology, and adventure within is religion.

عشق اور جستجو ہے انسان کا nucleus۔ لیکن کس کی جستجو؟ جستجوئے جمال! انسان کے ظاہر اور باطن میں The Beauty کو پانے کا اضطراب ہے۔ Science بھی ایک عشق ہے اگرچہ مادی سطح پر ہے لیکن ہے تو ہر ایک کو جمال کی تلاش۔ لیکن فرق یہ ہے کہ عشق اور جستجو کس نسبت سے کرتا ہے۔ یعنی یہ سوالات گفتگو میں آ کے رہیں گے کہ

What to do, and what not to do?
How to do, and how not to do?
For whom to do, and for whom not to do?
Where to do and where not to do?

ان سوالات کا سامنا کرنا پڑے گا، ان کے جوابات کا فیصلہ کرنا ہوگا اور وہ فیصلے in all the spheres ہوں گے۔ ہر discipline of knowledge ایک فیصلہ ہی تو ہے۔ Science بھی ایک فیصلہ ہے۔ ان سوالات کا تناسب اور ان سوالات کے فیصلوں سے تہذیب ترتیب پاتی ہے اور اسی سے cultures and civilizations کے امتیازات متعین ہوتے ہیں۔ Culture ایک architectural plan ہے اور civilization عمارت سازی۔ تصورِ حقیقت سے culture پیدا ہوتا ہے۔ حقیقت کس کو مان رہے ہیں؟ کیا مادے کو حقیقت جانا، یا شعور کو، یا خدا کو؟ اس سے culture اور ذہنی مؤقف مختلف ہو جاتے ہیں۔ ہر طرزِ زیست رکھنے والے اپنے تصورِ حقیقت اور طرزِ زیست کو پوری انسانیت کا تصورِ حقیقت اور طرزِ زیست بنانے کی

کوشش کرتے ہیں۔فراق ووصال کے مفہوم ہی ادیان ہوتے ہیں۔ابتداء کس کو کہا اور انجام کس کو؟ ابتداء اور انتہا کی کیا definitions کیں؟ پہلا فیصلہ تو مبداء اور معاد کا فیصلہ ہی ہے۔ ان سوالات کے جو بھی جوابات ہوں گے وہی فیصلہ ہوتا ہے۔

یہاں کے ہیں یا کہیں کے ہیں؟

یہاں سے ہیں یا کہیں سے ہیں؟

یہیں کو ہیں یا کہیں کو ہیں؟

ان سوالات کے جوابات مختلف ہونے سے culture مختلف ہو جاتے ہیں تہذیبیں مختلف ہو جاتی ہیں تمدن مختلف ہو جاتے ہیں اور غم ونشاط کے فیصلے ہوتے ہیں۔پھر انہی فیصلوں کا اظہار فنونِ لطیفہ اور culture کے دوسرے تمام شعبوں میں ہوتا ہے اور تمدن کے امتیازات متعین ہوتے ہیں۔

۲۱۔ ذوقی ادراک کو حکمت وفراست کہتے ہیں اور یہ کشف سے بلند چیز ہے۔کشف کی مثال telegram کی سی ہے اور فراست کی مثال telephone call کی۔حدیثِ مبارکہ ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور میں دیکھتا ہے۔یعنی صاحبِ فراست بحیثیت مجموعی چیزوں کی حقیقت جانتا سمجھتا ہے۔جواب پہلے ذہن میں آتا ہے اور سوال بعد میں۔اُس جواب سے شرحِ صدر ہو جاتا ہے اور صاحبِ فراست جواب کے صحیح ہونے کی دلیل کا محتاج نہیں ہوتا۔کشف چوبیس گھنٹے رہنے والی چیز نہیں جبکہ فراست تو چوبیس گھنٹے رہنے والی چیز ہے۔

۲۲۔ کئی غیر مسلم بہت متقّی ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی کچھ internal agencies ایسی صاف ہو جاتی ہیں کہ انہیں بھی کشف حاصل ہو جاتا ہے۔ان کی باطنی سماعت و بصارت کی range بڑھ جاتی ہے۔لیکن فرق آئینے کے شفاف ہونے یا عکس لہرانے کا نہیں بلکہ فرق تو آئینے کو عرقِ گلاب سے صاف کرنے یا پیشاب سے صاف کرنے کا ہوتا ہے۔ریاضتوں سے sixth sense کی purification ہو جاتی ہے جس سے وہ کچھ مناظر دیکھنے کے قابل ہو جاتی

ہے لیکن یہ heart کی agency کا کام نہیں ہوتا۔

۲۳۔ اصل گہرائی میں لوگوں نے اب باتوں کو پڑھ سمجھ نہیں رکھا۔ جسے جتنا منظر دکھائی دے رہا ہو اگر چہ وہاں تک تو منظر ایسا ہی ہوتا ہے جیسا نظر آرہا ہے لیکن اس ایک منظر کو کُل مناظر قرار دینا غلط روش ہے۔ آج کل خانقاہی نظام کی اکثریت ایسی ہے جو جہاد کے غیر متبدّل اصول کی تخفیف و تحقیر کر رہی ہے اور تمام تر زور فقط جہاد بالنفس پر ہے اور جہاد بالسیف کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ یہ مذہب کے ایک دائرے کو کُل قرار دینے کا فتنہ اور جز و کو کُل قرار دینے کا عذاب ہے۔ اس طرح کی یک رُخی سوچ سطحیت اور تنگ نظری سے جنم لیتی ہے۔ سطحیت اور تنگ نظری کا مسئلہ تو صرف اور صرف صحابیت پہ جا کر حل ہونا ہے۔ اصولِ تربیت تو کسی تربیت یافتہ کو دیکھ کر ہی معلوم ہوں گے، تربیت کُنندہ کو دیکھ کر تو معلوم نہیں ہو سکتے۔ عظیم قوم بننے کے لئے ہر شعبہ کے کاملین درکار ہیں۔ کوئی گوشہ نشینی میں تو کوئی تفقّہہ میں، کوئی جہاد و قتال میں تو کوئی شعر و سخن میں، غرضیکہ ہر شعبے کے کاملین۔ جامعیت تو شانِ نبوّت ہے۔ لیکن دوسرے سارے کام تصوف کی روشنی میں کیئے جائیں گے۔ تصوف کو مرکز و محور قرار دینا جز و کو کُل قرار دینا ہر گز نہیں۔ تزکیہ، تصفیہ اور قوتِ ایمانیہ کے بغیر تبلیغ اور جہاد کیسے ہوسکتا ہے؟! دوسری طرف ہم تصوف والوں کو بھی یہ یاد رہے کہ نماز، روزہ، ذکر و فکر غلبے کی علّت نہیں، شرط ہیں۔ غلبے کی علّت تو جہاد ہی ہے۔ حدیثِ مبارکہ ہے کہ جو جہاد کی تمنا لئے بغیر مرا، وہ منافق مرا۔ اس حدیثِ مبارکہ میں جس جہاد کے بارے میں فرمایا گیا ہے وہ جہاد بالسیف ہی ہے۔ جہادِ اکبر، جہاد بالنفس اور تصوف کے نام پر جہاد و قتال اور جہاد بالسیف کی نفی، تخفیف یا تحقیر ہر گز بھی نہیں کرنی چاہیے۔ تصوف والوں کو کچھ خوفِ خدا کرنا چاہیے کیونکہ سیف زنی یعنی جہاد و قتال تو کارِ نبوّت ہے۔

۲۴۔ علم ہو، کشف ہو یا معرفت، اصل چیز تو یہ ہے کہ ان کا content کیا ہے یعنی وہ کس چیز سے متعلق ہیں۔ Content کے status سے اُس علم، کشف، معرفت کا status طے

ہو گا۔ اصول یہ ہے کہ علم کی قدر و قیمت معلوم کی قدر و قیمت سے متعیّن ہوتی ہے اور عالم کی قدر و قیمت علم کی قدر و قیمت سے۔ ایک شخص کسی ایک بلند درجے کی حقیقت کا علم رکھتا ہو جبکہ ایک دوسرا آدمی پانچ لاکھ چیزوں کا علم رکھتا ہو مگر وہ ہوں کم درجے کی تو بلند درجے والا آدمی وہی ہو گا جو بلند درجے کی حقیقت کا علم رکھتا ہے۔ اور اگر کوئی دو افراد پچاس پچاس بلند درجے کی چیزوں کا علم رکھتے ہیں تو پھر یہ دیکھا جائے گا کہ اُن پچاس میں بلند اور عظیم حقیقت کونسی ہے۔ پھر مزید باریک بات یہ ہے کہ جاننا تو ہے لیکن کیا انہیں دیکھا بھی ہوا ہے یا خالی جانکاری ہی ہے! جس نے جاننے کے ساتھ ساتھ دیکھا بھی ہے اس کا status بلند ہوگا ان لوگوں سے کہ جن کے پاس صرف جانکاری ہے۔ پھر یہ کہ جس حقیقت کو دیکھا، کیا اُس سے کوئی عشق و عاشقی بھی ہوئی یا صرف دیکھنا ہی حاصل ہوا؟! یہاں پر عاشقی والے کا status بلند ہوگا۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ آپ کو محبت عشق ہو گیا جسے دیکھا تھا لیکن کیا اُسے بھی آپ سے محبت، عشق ہوا؟! جس سے اُس حقیقت کو بھی عشق ہو جائے اُس کا مقام سب سے بلند ہوتا ہے۔ کشفِ کونی کو تو بے حیثیت کہا گیا ہے لیکن کشفِ الٰہی تو بہت superior چیز ہے۔ عرفِ عام میں ساری باتوں کو کشف و الہام کہتے ہیں لیکن علمِ لدُنی تو بہت عظیم علم ہے۔ اور علمِ لدُنی کے معنی ہیں کہ نگاہِ کشفی سے ذات و صفاتِ الٰہیہ کا انکشاف! بس بات یہی ہے کہ کس grade اور status کا کشف ہے، بلند حیثیتی اور کم حیثیتی کا فیصلہ اسی سے ہوگا۔

۲۵۔ سلطنت مقصود نہیں لیکن ذریعوں میں کا ایک ذریعہ ہے۔ تحریکی تنظیمی اسلام نے یہ گڑ بڑ بہر حال کی ہے کہ اسے مقصود بنا دیا اور سیاست کو کعبۂ مقصود بنایا۔ علماء اور مشائخ جب تک حکمران طبقوں کے مصلح کا کردار ادا کرتے رہے تب تک کام ٹھیک رہا۔ اب جب ان کی اصلاح کرنے والا نہیں بنا تو جو حال اب ہو چکا ہے یہ تو ہونا ہی تھا۔ رہنمائی بڑا منصب ہے خود حکمران بننے سے۔ کوئی بہت بڑا سائنسدان اگر لیبارٹری سے نکل کر سیاست میں آ جائے تو سیاست کا بھٹہ بیٹھ جائے گا۔ دینی رہنمائی سے disconnected جو سیاست ہے وہ چنگیزی ہے۔

تو نے کیا دیکھا نہیں یورپ کا جمہوری نظام
چہرہ روشن ، اندروں چنگیز سے تاریک تر

تحریکی اسلام میں اکثر یہ بات کہی جاتی ہے کہ دین اور سیاست ایک ہیں۔ دین اور سیاست ایک ہیں لیکن یہ بتا دیں کہ سیاسی دین چلے گا کہ دینی سیاست!؟ اور دینی سیاست کا مطلب ہے کہ سیاست دان دینی دائروں میں رہیں اور جن کا کام ہے سیاست دانوں کو دینی دائروں میں رکھیں وہ اُنہیں دائروں میں رکھیں۔ علماء و مشائخ اور سیاستدانوں کو اپنے اپنے دائروں میں کام کرنا چاہیے۔ حدیثِ مبارکہ کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ سب سے اچھا امیر وہ ہے جو فقیر کے دروازے پر آتا ہے اور سب سے بدترین فقیر وہ ہے جو امیر کے دروازے پر جاتا ہے۔

نسلِ انسانی کے سارے اُمور درست کرنے کے لئے جتنے بھی انبیاء کرامؑ مبعوث کئے گئے اُن میں سے کتنے حکمران تھے؟ اگر حکمرانی سے کام ہونا ہوتا تو تمام انبیاء کرامؑ حکمران ہوتے لیکن حکمران تو صرف حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ ہیں۔ دینی اور علمی حکمرانی کتنی بڑی چیز ہے علماء اور مشائخ اس چیز کو بھول گئے ہیں۔ علماء اور مشائخ تو اب بھی ہیں لیکن اگر عزت اور احترام نہیں تو وہ علماء اور مشائخ ہیں ہی نہیں۔ علم و کردار دونوں ہوں یا ایک بھی ہو تو آج بھی بے حد احترام کیا جاتا ہے۔ حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ تمدنی اُمور واحکام دین کے مقاصد و غایات میں سے نہیں، اور حضرت سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ سلطنت وحکومت دین کی خادم ہے مخدوم نہیں۔ مقصدِ اول و آخر تو رضا طلبی اور لِقا طلبی ہے۔ انکشافِ وجھہ ہی اصل ہے، ایک انکشاف یہاں اور ایک انکشاف آخرت میں ہے۔ جمالِ ربانی کے مطالعہ و مشاہدہ کے لئے انسان کو تخلیق کیا گیا ہے۔ باقی ایک منزل کی طرف بڑھنے میں جو واقعات ہوں ان سے متعلق بھی مسافروں کے لئے احکام ہیں۔ اصل کام تو منزل کی طرف چلنا ہے اور منزل کی طرف چلنا ہی دینی کام ہے۔ درمیان میں جو دشواریاں یا واقعات پیش آئیں وہی تمدنی، سماجی، معاشی مسائل ہیں۔ کئی قرآنی حدیثی احکام کا اجراء سلطنت وحکومت کے بغیر ممکن نہیں ہے، لیکن اُن میں بھی سلطنت وحکومت دین کے ہاتھ میں ایک tool ہے مقصود نہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ اگر مسلم تہذیب وتمدن اور دینی علوم واعمال کو غیر مسلم کے حملوں کا خطرہ ہے تو اس کا دفاع مقصود ہے اس

لئے مقصدِ دفاع کے لئے سلطنتی نظام ایک مجبوری ہے۔ دفاع کے لئے سائنس بھی درکار ہے اور سلطنت وحکومت بھی۔ دوسرا یہ کہ مسلم افراد اور مسلم معاشروں کی دنیوی بدنی ضرورتوں کے لئے بھی سائنس اور سلطنت معاون ثابت ہوتی ہے۔ بدن رہے گا تو کارِعبادت کیا جائے گا اگرچہ فاعلِ حقیقی تو قلب ہے لیکن بدن کی سواری کے ذریعے ہی وہ کام کرے گا۔ یہاں بھی بدن کا آرام کارِعبادت کے لئے درکار ہے اور اسی لئے ذریعے کے طور پر سائنس اور سلطنت ناگزیر ہیں لیکن انہیں مقصود یعنی منزل نہیں بنانا۔ حضور نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا کہ دنیا کی لکڑیوں سے دین کی دیگ پکانی ہے۔ لکڑیاں دیگ کے contents یا مقصد نہیں ہوتیں۔ اسی تناظر میں مال و دولت، سائنس، سلطنت کو دیکھیں گے تو بات سمجھ میں آ جائے گی۔

آب در کشتی ہلاکِ کشتی است

زیرِ کشتی بحرِ کشتی پُشتی است

ہمارے صوفیاء کرامؒ کا vision تو اتنا clear رہا ہے لیکن اب باتیں الجھا دی گئی ہیں۔

۲۶۔ لکڑہارے کو جنگل سے لکڑیاں کاٹنی ہوں تو اُسے یہ کام رات کی تاریکی میں نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اگر رات کی تاریکی میں یہ کام کرے گا تو سانپ کو رسی سمجھ لے گا، تو پھر کیا انجام ہوگا؟ اسی طرح جب تک قلب میں توحید کا سورج روشن نہ ہو تو اس تاریکی میں دنیوی کام ایسے ہوں گے جیسے لکڑہارے کا اندھیرے میں سانپ کو رسی سمجھ لینا۔ بڑے پیر صاحبؒ (حضرت عبدالقادر جیلانیؒ) فرمائے ہیں کہ تم تخت نشین رہو، دنیا تمام لذتوں کا طباق کنیز کی طرح سر پر رکھ کر آئے اور کہے کہ شیخ، قبول فرمالیں۔ روزمرہ زندگی میں کافر اور مسلم تو ایک ہی طرح کے کام کرتے ہیں، صورتِ کار تو ایک ہی ہوتی ہے لیکن حقیقتِ کار یکسر مختلف ہوتی ہے۔ حضرتِ والاؒ نے فرمایا کہ کافر اور مسلم کے ننانوے فیصد کام صورتاً ایک جیسے ہیں، لیکن محرکِ عمل بدلنے سے عمل کی حقیقت بدل جاتی ہے۔

۲۷۔ اب لوگ تمام سلاسل کے بزرگوں پر بھروسہ نہیں کرتے اور پھر پتہ نہیں روحانی

وسعتیں کس سے کس طرح مانگتے ہیں۔ اگر سلسلے میں داخل ہو کر بھی mental reservations نہیں جاتیں تو قلب کی اور کون سی ہزار گز موٹی کدورتیں دور کرنا چاہتے ہیں۔ قلب کے ارد گرد steel کی دیواریں ہیں۔ سوچ ہی اگر صحیح نہیں کرنی تو پھر کیا ہونا ہے، کون سی بلندی حاصل ہونی ہے۔ اب اُلوہیت اور رسالت ان کی نجی ملکیت بن گئی ہے۔ دھوپ کو، ہواؤں کو تو آج تک کسی نے نجی ملکیت لکھنا کہنا تو کیا سوچا بھی نہیں، الوہیت اور رسالت کو اپنی نجی ملکیت سمجھتے ہیں۔ وسعتِ قلبی کے حصول کے لئے وحدتُ المشائخ کے اُصول پر آنا پڑے گا۔

۲۸۔ آنکھ، منظر اور روشنی! یہ تین لفظ ہمیں معلوم ہیں لیکن ان میں سے کوئی ایک نہ ہو تو باقی کس کام کے؟! کوئی شے ہوگی، کوئی اس کا جاننے والا ہوگا، اور پھر کوئی agency بھی ہوگی کہ جس سے جانکاری ہوگی، تب ہی تو بات پوری ہوگی۔ اگر روشنی نہ ہو تو پھر جانکاری کیسے ممکن ہوگی!؟ اپنے اندر باہر جو کچھ ہو رہا ہے اس پر غور کیا کریں۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ فیہِ ذکرکم افلا تعقلون جنابِ حق تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ اپنی عقل apply کیوں نہیں کرتے، جو کام اس سے لینا ہوتا ہے وہ کیوں نہیں لیتے۔ سماعت بھی ہے اور دیکھتے بھی ہیں، لیکن پھر بھی نہیں سُنتے دیکھتے، مراد یہ کہ جس کو دیکھنا کہتے ہیں اس طرح نہیں دیکھتے یعنی بات تو سمجھ میں آ چکی ہے لیکن قبول نہیں کیا، سمجھ میں آ جانے کے باوجود عدمِ قبول ہے۔ ہر بات کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن۔ یہ بات ہرگز نہیں کہ induction بالکل ہی غلط ہے بلکہ جہاں inductive reasoning چلے گی وہاں اسی سے کام لینا ہوگا یعنی جہاں تک عقل کی رسائی ہے وہاں تک تو عقل ہی سے جانا ہوگا۔ یؤمنونَ بالغیب تو ایک ہوائی سفر ہے، یہاں inductive reasoning نہیں چلے گی۔ دین کی جو باتیں اِدھر کی ہیں ان میں عقل اور استدلال کام آئیں گے۔ خدا، نبوت، آخرت، یہ اصل غیبی حقائق ہیں۔ خدا کی ذات وصفات، وحی، آخرت، روح، ان میں عقل کی سواری نہیں چلے گی، لیکن وراثت کے قوانین میں تو عقل ہی چلے گی، طلاق کے مسائل میں انسانی رویوں کی بحث ہوگی، اور یہاں قصۂ زمیں برسرِ زمیں ہوگا۔ خدا اور آخرت کا ادراک عقل سے بھی ممکن ہے یعنی وحی کی رہنمائی کے بغیر بھی

ان کا ادراک ہوسکتا ہے لیکن دین کے مفصل احکام وحی کے بغیر معلوم نہیں کئے جا سکتے۔ قرآنِ کریم میں ایمانِ عقلی کا ذکر پہلے ہے اور ایمانِ نقلی کا بعد میں، اور ان سے بھی پہلے ذکر۔ تفکُّر ذکر کے بعد ہوتا ہے۔ اسلام اور اصولِ اسلام سے زیادہ عقل و استدلال پر پورا اترنے والی اور کوئی چیز نہیں اور عقل اور فطرت کا احترام جتنا اسلام میں ہے کسی اور میں ہے ہی نہیں۔ دنیا دار جس کو عقل کہتے ہیں وہ بدترین بے عقلی ہے اور بلادت ہے۔

۲۹۔ اللہ، نبی اور شیخ کا ارتباطِ باہمی تو ایک حقیقت ہے۔ توسل پہ گفتگو کرتے ہوئے اس ارتباطِ باہمی کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ایک تو اِس طرف (انسان) سے اُس طرف (خدا) توسل ہے، لیکن ایک اُس طرف سے اِس طرف ہر زاویے اور ہر دائرے میں توسل ہے۔ خدا سے انسان کی طرف بھی کئی واسطے ہیں اور انسان سے خدا کی طرف بھی کئی واسطے ہیں۔ توسل پر اعتراض کرنے سے پہلے ذرا خدا سے نظامِ دہر کی طرف بھی دیکھ لیا کریں، واسطوں کی زنجیر نظر آ جائے گی۔ الھادی تو جنابِ حق تعالیٰ ہیں لیکن ہدایت دینے میں انبیاءِ کرامؑ اور آسمانی کتب کا توسُّط اور توسُّل کیوں ہے۔ جس انسان کو بھی شعورِ اسلام دینا مقصود ہوا سے خدا تعالیٰ براہِ راست شعور دے دیں۔ وہ القادر ہیں یہ کر سکتے ہیں۔ حق اور خلق کے درمیان رابطے کی ایک کڑی نبوت کیوں رکھی حالانکہ ہدایت رسانی براہِ راست فاعلِ حقیقی کا اپنا فعل ہے۔ اور پھر اس بات پہ بھی ہمیں غور کرنا چاہیے کہ خدا اور نبی کے درمیان حضرت جبرائیلؑ کا کیا کام ہے؟ قرآنِ کریم پہلے لوحِ محفوظ پر اتارا، تو یہ درمیان میں لوحِ محفوظ کا واسطہ کیوں رکھا؟ فصل صرف مشیتِ الٰہی سے ہی پک جائے، درمیان میں بارش اور دھوپ کو کیوں مانگتے ہیں؟ ان تمام واسطوں پہ غور تو کرنا چاہیے۔ لیکن جیسے ہی روحِ انسانی کا توسط درمیان میں آیا تو شرک کی بحث چھڑ جاتی ہے۔ روحِ انسانی کو واسطہ بنانے پر اعتراض ہے اکثر لوگوں کو مگر بارش دھوپ کو واسطہ بنانے پر کوئی اعتراض نہیں۔ بارش کے ہر ہر قطرے کا علیحدہ فرشتہ ہے، اس قدر درمیانی واسطے ہیں کہ واسطے کا انکار ممکن نہیں۔ اب ملائکہؑ پر بھی جھگڑا نہیں اور مادی چیزوں کے خواص پر بھی کوئی بحث نہیں، ان میں تو شرک ہوتا نہیں تو اب بحث رہ گئی روحِ انسانی کی۔ انسانی حیات ہمرشتگیوں کا نام

ہے۔آدمی دوسروں سے توقعات رکھتا ہے، امیدیں باندھتا ہے، سفارش کرتا ہے۔آخر یہ سب کیا ہے؟ لیکن جب لفظِ روحانیت آجاتا ہے تو پھر لوگ گڑ بڑ مچا دیتے ہیں اور شرک کا فتویٰ فوری طور پر لگا دیتے ہیں۔جبکہ لفظِ مسبّب کے اطلاق سے شرک شروع ہوگا اور نبی یا شیخ کو فاعلِ حقیقی تو کوئی نہیں کہہ رہا تو پھر لفظِ شرک کہاں سے آ گیا۔روح میں تأ ثیریں اور خواص جب رکھے ہیں جنابِ حق تعالیٰ نے تو ان خواص کا انکار کیوں کرنا! جیسے سورج کی حرارتوں سے استفادہ کیا جاتا ہے تو ارواحِ اولیاء کی روشنیوں اور حرارتوں سے بھی استفادہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔لفظِ مرگ تو صرف جسم پر وارد ہوتا ہے۔صفتِ حیات تو اصل میں روح کی صفت ہے۔ایک سواری واپس لے کر ایک نئی سواری عطا کر دی جاتی ہے، یہ واقعہ مرگ ہے۔روح کو جب تدبیرِ جسم کرنا پڑتی ہے تو اس کی قوتوں کا ایک حصہ اس میں خرچ ہوجاتا ہے اور جب جسم سے آزادی مل گئ تو اب اس کی قوت خالص روحانی کاموں کے لئے رہ گئ۔اس طرح ارواحِ اولیاء بھی فیض رسانی فرمارہی ہیں بس رابطہ ہوجانے کی دیر ہے۔رابطے کی جو صورتیں کسی کے لئے نامعلوم ہیں تو ان کے نامعلوم ہونے سے وہ ناموجود نہیں ہوجائیں گی۔ارواحِ اولیاء سے فیض حاصل ہوتا ہے، اور اس فیض کی موجودگی کسی کی فہم میں آ کر موجودی حاصل کرے گی تو ایسا ہرگز نہیں۔لیکن اب جو لوگ توسل، واسطے اور ارواح کی فیض رسانی کا انکار کرتے ہیں وہ ان کی نافہمی ہے۔کم عقل کو لطیف حقائق کیسے معلوم ہوسکتے ہیں!

۳۰۔ جسے امتِ مسلمہ کہا جاتا ہے اس سے مراد موجودہ مسلم governments ہیں لیکن ان حکومتوں میں کسی کا کوئی اشتراکِ فکر وعمل نظر نہیں آتا۔اگر governments ٹھیک نہیں تو دینی علماء میں وہ اشتراکِ فکر وعمل ہوجائے۔ایک ملک میں دینی گروہوں کے رہنماؤں کا اشتراکِ فکر وعمل ہوگا تو پیروکاروں میں بھی وہ اشتراک ہوسکے گا جبکہ صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔کہیں بھی اشتراک کی صورت نظر نہیں آتی، ہاں جذباتی طور پر جو مرضی کہے جائیں۔امیرُ المؤمنین کے لفظ کا اطلاق اب کہاں ممکن ہے؟ اور پھر کہیں مؤمنین ہوں گے جو جہاد کو نکلیں۔جہاد کے لئے پہلے مؤمنین ہونا پڑے گا۔اگر ساتھیوں نے ہی betrayl کرنا ہے تو وہ مؤمنین ہی کیا ہوئے۔تمام

گروہوں میں اشتراک اور اتحاد کی صورت تو نظر آئے۔صرف کہنے سے تو جہاد نہیں ہو جائے گا ناں۔ قرآن وحدیث کی کسوٹی کو ذرا ٹھنڈے دل سے apply کریں۔ایک ہے جہاد وقتال کے احکامات اور ایک ہے ان احکامات کا صورتِ حال پر اطلاق۔ پہلے احکامات پورے کئے جائیں گے اور پھر صورتِ حال پر ان کا اطلاق ہو گا۔کلّیوں کو جزیوں سے مربوط کریں اور جزیوں کو کلّیوں سے۔ جذباتیت کا نام جہاد نہیں۔شرع شریف میں ہر کام کی مکمل رہنمائی موجود ہے۔اب جو انتشار اور عدم اشتراک کی صورتِ حال ہے یہ روسیوں یا امریکیوں کی پیدا کردہ تو نہیں ہے۔اگر انہوں نے پیدا کی بھی ہے لیکن پیدا کروائی تو ہم نے ہے۔مسلم ممالک کے سربراہان کسی ہوٹل میں صرف تین دن کے لئے اکٹھے ہو جائیں۔دینی رہنما کہیں کسی جگہ چند دن اکٹھے رہیں۔صرف اتنا کام کرلیں تو ہم ایک عظیم قوت بن جائیں گے۔یہ عسکری جنگ ہے ہی نہیں بلکہ یہ تو فہم کی جنگ ہے۔بے وضو کبھی کسی نے نماز نہیں ادا کی چاہے جتنی بھی خراب پڑھے۔رمضان کے روزے ماہِ شعبان میں نہیں رکھے جاتے۔ اسی طرح جہاد کے بھی کچھ اصول وضوابط ہیں۔ہمیں امتِ مسلمہ کے بے قوت ہونے کا دکھ کم ہو جائے، یہ نہیں ہوسکتا۔شوقِ شہادت کس کے لہو میں چٹکیاں نہیں لیتا! لیکن کیا اب خلاء میں سر مارا جائے؟! حضرت تھانویؒ صاحبِ فراست ہیں۔جہادِ پاکستان میں انہوں نے پورا ساتھ دیا۔حضرتؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ امیر میں تین خصوصیات کا ہونا لازم ہے۔

۱) عالمی سیاسی داؤ پیچ کی ساری حقیقتیں سمجھنے کی پوری آگہی ہو۔اس علم وآگہی سے پوری طرح مسلح ہو۔

۲) بلند ہمتی

۳) دین داری

غور کرنے کی بات ہے کہ دین داری کو حضرتؒ نے تیسری بات لکھا ہے۔مزید یہ تحریر فرمایا کہ پہلی دو خصوصیات مکمل سے مکمل اور پوری کی پوری کسی مسلمان میں جو ہوسکتی ہیں اس وقت وہ قائدِ اعظم ہیں اور کسی عالم میں نہیں،اور تیسری چیز قائدِ اعظم میں پیدا کی جاسکتی ہے۔ہم حضرتؒ کی راہ پر ہیں کوئی اپنی ذاتی راہ پر نہیں۔لیکن یہ بات ہمیں ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، تزکیہ یہ غلبے کی علّت نہیں ہیں۔غلبے کی علّت تو قتال ہے اور قتال ہجرت کے بغیر نہیں ہوسکتا۔پہلی شرط ہجرت ہے اور

ہجرت بعد از معراج ہے۔معراج سے مراد روحانی فتح ہے۔ پہلے روحانی فتح حاصل ہو گی تو پھر باقی فتوحات تو corollary ہیں اُس روحانی فتح کی۔ روحانی فتح حاصل ہو لے گی تو پھر ارضی سطح پر جہاد وقتال غلبے کی عِلّت بنتے ہیں۔اصول تو ذات وحیاتِ رسول سے طے ہوں گے۔

۱۳۔ کتابُ اللہ اور رجالُ اللہ۔ان دونوں کا ربط سمجھنا چاہیے۔کتابُ اللہ کو رجالُ اللہ سے سمجھیں اور رجالُ اللہ کو کتابُ اللہ سے۔اگر دونوں کو علیحدہ علیحدہ کر کے چلیں گے تو فرقہ بازی جنم لے گی۔آج کل ہمیں جو مصیبت پڑی ہوئی ہے وہ ضالّین اور مغضوبین کے طور طریقوں کو اپنانے کی بدولت ہے۔ ہمارے social patterns میں، eating norms میں اور clothing میں Juda-Christian Culture در آیا ہے۔ دینی رسوم میں Hinduism کا عنصر داخل ہو چکا ہے اور ہماری intellectual tendencies Judaism and Christianity based ہیں۔ان حالات میں شرک کے خطرے کا سدِّ باب کرنے کے لئے ہر وقت جیب میں atomic light رکھیں یعنی عقائد کی درستگی اور ایمان کی پختگی۔ نام نہاد جدید تعلیم یافتہ دانشور انسان کے انسان ہونے کی جو تشریح کرنا چاہتے ہیں اس میں سے اللہ کو minus کرنا چاہتے ہیں کیونکہ اپنی من مانی نہیں چھوڑنا چاہتے ورنہ حقائقِ غیبیہ سے تو کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ یہ نفسیاتی مسئلہ نہیں بلکہ نفسانی مسئلہ ہے۔ پابندی سے بچنے کے فارمولے ہیں۔ خدا، نبی اور وحی کی پابندیوں سے بچتے ہیں اور Bertrand Russel اور physical laws کی پابندیوں کو برداشت کر لیتے ہیں۔اللہ اور اللہ کے رسول کے فیصلوں سے بھاگیں گے اور ماحول، عُقلاء کے عقلی فیصلے اور فلسفے کے پیشواؤں کے فیصلوں کو بغیر سوال اٹھائے پورے دل وجان سے مان لیں گے۔اس عہد میں اب آزادی کو لاقانونیت کے مساوی بنا لیا گیا ہے۔ اخلاقیات سے تو چھٹکارا ہو نہیں سکتا، اب اگر نبوی اخلاقیات نہیں تو کسی بندے کے بنائے ہوئے اصولوں کو ماننا تو پڑے گا۔اور غیر ربانی علوم فقط حماقت اور ضلالت کے علوم ہیں۔ جب کسی چیز سے لفظِ خدا کو منفی کیا جائے گا تو سوائے گمرہی کے اور اس میں کیا ہو سکتا ہے۔

عقل، فطرت اور مذہبی رہنمائی تینوں ایک چیز ہیں۔ اگر ان میں سے مذہبی رہنمائی minus کر دی جائے تو باقی دو میں کوئی ہم آہنگی نہیں رہتی۔ یہ بات ہمیں ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اسلام کا سب کچھ مدلّل ہے، اور غیر اسلام کا کچھ مدلّل نہیں۔ اسلام کے معنی حقیقت بینی، حقیقت دانی، حقیقت فہمی، حقیقت شناسی اور حقیقت یابی کے ہیں۔ الحق کے الحق ہونے کا اظہار الاسلام کے الاسلام ہونے کا نام ہے۔ عربی زبان میں The Truth and The Reality دونوں کے لئے لفظِ الحق آتا ہے، باقی ہر زبان میں دونوں کے لئے علیحدہ علیحدہ لفظ آتے ہیں۔ جو unreal ہے وہ کبھی Truth نہیں ہوسکتا۔ غیر اسلامی بات کبھی حقیقی نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ صرف فرضی ہے اور ایک نہایت غلط ظن وتخمین ہے، اس لئے جنابِ حق تعالیٰ علم کے مقابلے میں تخمین کا لفظ لاتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ فماذا بعد الحق الا الضلال۔ جب الحق آ گیا تو جو باقی رہا وہ گمرہی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس آیتِ مبارکہ میں الحق دین کو کہا گیا ہے۔ The Truth اور The Real ایک ہی لفظ ہیں۔ جو The Real ہو وہی The Infinite اور The Absolute ہوسکتا ہے۔ ایسا خدا کے سوا کوئی نہیں! لیکن اب غیرِ خدا کو The Real and The Truth کہے جا رہے ہیں۔ جدیدیت نے تصورِ حقیقت خراب کر دیا ہے۔ الحق تو واحد ہے اور وہ الحق المبین ہے۔ مبین سے مراد یہ ہے کہ واضح، روشن اور concrete تو بس وہی ہیں اور جن کو ہم واضح، روشن اور concrete کہتے ہیں وہ واضح اور روشن نہیں۔ الحق میں نامعلوم اور غیر واضح ہونا لگا ہی نہیں ہوا۔ ہم الٹا چل رہے ہیں۔ معلوم اور محسوس تو فقط الحق ہے۔ غیرِ حق محسوس معلوم کیسے ہوسکتا ہے؟! اب لوگ دھوکے میں زندہ ہیں۔

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے معلوم
جز وہم نہیں ہستئ اشیاء مرے آگے

ہست کو نا ہست سمجھ رہے ہیں اور نا ہست کو ہست سمجھ رہے ہیں۔ یہ سمجھ کی خرابی ہے اور اس کا بھی کوئی سبب تو ہے ناں۔ بھینگی آنکھ کو ایک کے دو نظر آتے ہیں۔ عقل کی آنکھ جب بھینگی ہوتی ہے تو اسے ایک کے دو نظر آتے ہیں۔ اگر آنکھ ٹھیک ہو تو پھر ایک ہی نظر آئے گا۔ اگر پہلے سے یہ طے کر رکھا ہو کہ یہ

ناموجود ہے تو پھر یہی چاہیں گے کہ وہ موجود دکھائی ہی نہ دے، پھر چاہے وہ موجود ہو تو بھی دکھائی نہیں دے گی۔ اگر internal involvement ہو تو نہ سنائی دینے والی آواز بھی سنائی دے جاتی ہے۔ عقلی اور جذباتی involvement کے حساب سے چیزیں exist کرتی ہیں۔ چیزیں جس حساب سے دکھائی دیں تو دیکھنے والا انہیں ویسا ہی کہے گا۔ ایک ہی قِسم کے لفظ سن کر دو آدمی مختلف مفہوم متعین کر لیتے ہیں۔ حضرتِ والاؒ نے فرمایا کہ خارج میں کچھ نہیں، جو کچھ ہے باطن میں ہے۔ وہی آنکھ ہے ایک پر پڑتی ہے تو محبت تخلیق ہوتی ہے، اور وہی آنکھ دوسرے پر پڑتی ہے تو نفرت تخلیق ہوتی ہے۔

۳۲۔ ہم تو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے ذوقِ توحید کو re-live کرتے ہیں۔ ہمیں ظرف سے نہیں بلکہ مظروف سے واسطہ ہے۔

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود

قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما جانتے ہیں

غرض اور مقصد تو صرف The Transcendent ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کا اللہ پن پانچ حروف میں reduce ہو جائے گا؟! بالکل نہیں۔ خود ہمارا concept یعنی خدا کو جیسے ہم نے conceive کیا وہ بھی تو خدا نہیں ہے۔ خانہ کعبہ، طواف، الفاظ سب چیزیں تو run-way ہیں۔ بلندی پر جانے سے کرّۂ ارض بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ جو انسان شُعورِ ذات میں زندہ ہوتا ہے صفات بھی اسے نظر نہیں آتیں۔ پھر ایسا مقام بھی آتا ہے کہ خود شعور بھی نہیں رہتا۔ وہاں فقط ذات کا ذات سے رشتہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اختیار مطلق ہے لیکن freedom of choice کا license خدا نے ہر بندے کو جاری کیا ہوا ہے۔ سڑک پر آنے اور اس پر بھاگنے کی آزادی حاصل ہے آدمی کو لیکن سڑک ہو گی تو یہ کام کر سکے گا۔ پھر یہ کہ سڑک بھی ہو اور بھاگنے کی آزادی بھی، لیکن بھاگنے سے پہلے جسم کے کسی حصے پر فالج گر جائے تو! یعنی وہ اختیار بھی دیتے ہیں اور سلبِ اختیار پر بھی پورا اختیار رکھتے ہیں۔ اب exclusiveness ہمارے دماغ کو لگی ہوئی ہے تو ایسے میں تقدیر کے مسئلے کی سمجھ کیسے آ سکتی ہے۔

تقدیرِ انسانی یا انسانی آزادی کے لفظ کو ایسے سمجھیں کہ اللہ کا ارادہ علم اور قدرت تو absolute ہیں لیکن کیا صرف بے اختیار رکھنے کا اختیار ہے؟ کیا اختیار نہیں دے سکتے؟! خدا نہ چاہے تو کسی کا صفر اختیار نہیں اور اگر خدا چاہے تو اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا کہ کتنا کیسا اختیار عطا کر دیا۔ پیدا ہونے سے پہلے کسی نے پوچھا تھا کہ کہاں پیدا ہونا ہے؟ تقدیر کی بات تو بعد میں ہو جائے گی۔ اور پھر موت کے بعد بھی کسی نے آپ کی رائے لینی ہے؟ تقدیر کا جھگڑا اگر ختم کرنا ہو تو لم یلد ولم یولد سے سب سمجھا جا سکتا ہے۔ عقلِ جزئی (Analytical Reasoning) تو شیطانی عقل ہے اس کو قرار نہیں۔ بندے کو بس یہ پتہ چل جائے کہ میری اوقات کیا ہے۔ اسی سے فلسفۂ تقدیر ختم ہو گا۔ یہ جان لیں کہ ہمارا نام قادرِ مطلق نہیں۔ جب نہیں ہے تو بس نہیں ہے۔ ایک رسی کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں اور ہر رسی کا طول واختصار ہی آزادی ہے۔ جب کھینچنے والے نے کھینچا تو عقل ٹھکانے آ جائے گی۔

۳۳۔ اب لوگ ایسے سوال بھی کرتے ہیں کہ حقائقِ غیبیہ کو عقل سے سمجھائیں، حالانکہ meta rational data بھی اتنا زیادہ ہے کہ عقل اس میں بھی خاموش ہے۔ خوشبو ایک sensuous reality ہے لیکن اس میں لفظ تو کیا idea تک involve نہیں۔ گلاب اور موتیے کی خوشبو کا فرق زبان کی گرفت میں نہیں آتا۔ گونگے تو ہم sensuous data میں ہیں حقائقِ غیبیہ کی بات تو الگ ہے۔

پوچھ مت کیفیتیں ان کی نہ پوچھ ان کا شمار
چلتی پھرتی ہیں مرے سینے میں جو پرچھائیاں

مغربیت زدگی نے عقل مار رکھی ہے بلکہ ہم خود بھی ایسا چاہتے ہیں۔ سارے مستشرقین (orientalists) بنامِ dispassionate analysis دانستہ الزام تراشی کرتے ہیں اور ابہام تخلیق کرتے ہیں۔ دشمن جب ہمارا دشمن ہے تو پھر وہ سارے ہتھیار لے کر آتا ہے اس لئے ہم دوستی کی توقع نہ رکھیں۔ ہم میں سے عسکری جہاد والے عسکری جہاد کریں اور قلمی جہاد والے قلمی جہاد کریں۔ مغربی علوم جو کہ علم ہرگز بھی نہیں ہم انکے نام نہاد علوم سے مرعوب کیوں ہیں۔ 'حساب جوں کا

توں، کنبہ ڈوبا کیوں' کُل مغربی علوم کی حقیقت یہی ہے۔

۳۴۔ عربی لُغت میں اسلام کے ایک معنی 'قرض ادا کرنے' کے ہیں۔ اسلام کے کُل اعمال قرض ہیں جو ہمیں ادا کرنے ہیں۔ سارا اسلام ادائے قرض ہے۔ ایمان لفظِ امن سے نکلا ہے اور صاحبِ ایمان ہونے کے معنی محفوظ اور مضبوط قلعے میں ہونے کے ہیں۔ کسی platform پر مضبوطی سے کھڑے ہونے کو ایمان کہتے ہیں۔ حصولِ توحید آسان کام نہیں۔ اور بہت کچھ حاصل ہو جاتا ہے مگر توحید جلد حاصل نہیں ہوتی۔ کلیجہ اصولِ وحدت کے قابو میں ہوگا تو توحید کی چاشنی حاصل ہوتی ہے۔ الٰہ صرف اللہ ہے۔ یہ بات ایک دو فیصدی بھی سمجھ میں آ جائے تو سارے جھگڑے ختم ہو جائیں اور سارے سوالوں کے جواب مل جائیں اور اگر یہ بات پلّے نہ پڑے تو کبھی کوئی جواب نہیں مل سکتا۔ اللہ ہی ہیں جو الصمد ہیں۔ الصمد کا ترجمہ بے نیاز کر لیا گیا ہے یعنی ہمیں جو کچھ ہو جائے انہیں کچھ پرواہ نہیں۔ عربی میں صمد اس چٹان کو کہتے ہیں جس سے جہاز لنگر انداز ہوتے ہیں اور لنگر انداز ہو کر ان کا ڈولنا اور ڈوبنا بند ہوتا ہے۔ چٹان تو اپنے سہارے جمی کھڑی ہے اب جس کو ڈوبنے سے بچنا ہے وہ چٹان سے لنگر انداز ہو جائے۔ اللہ وہ ہے کہ سبھی اس کا سہارا پکڑتے ہیں۔ وہ الصمد ہیں، نردھار ہیں۔ بے پرواہ اور بے نیاز کا مفہوم ہمارے ذہن میں ٹھیک نہیں ورنہ لفظ تو یہ بھی درست ہیں۔ صمدیت یہ ہوتی ہے کہ اسے کسی سے کچھ نہیں چاہیے اس کی طلب کسی سے وابستہ نہیں۔

۳۵۔ صوفی کو حقیقتِ اشیاء کا علم ہوتا ہے۔ کثافتوں سے تو جاہل ہونا ہی اچھا ہے، ہمیں تو لطافتوں کی تلاش میں رہنا چاہیے۔ ذہنی ورزش اور عقل کے جوڈو کراٹے انسان کے کام نہیں آتے۔ کام تو محبت سے ہوتا ہے یعنی جب

دل لگی دل کی لگی بن جائے گی

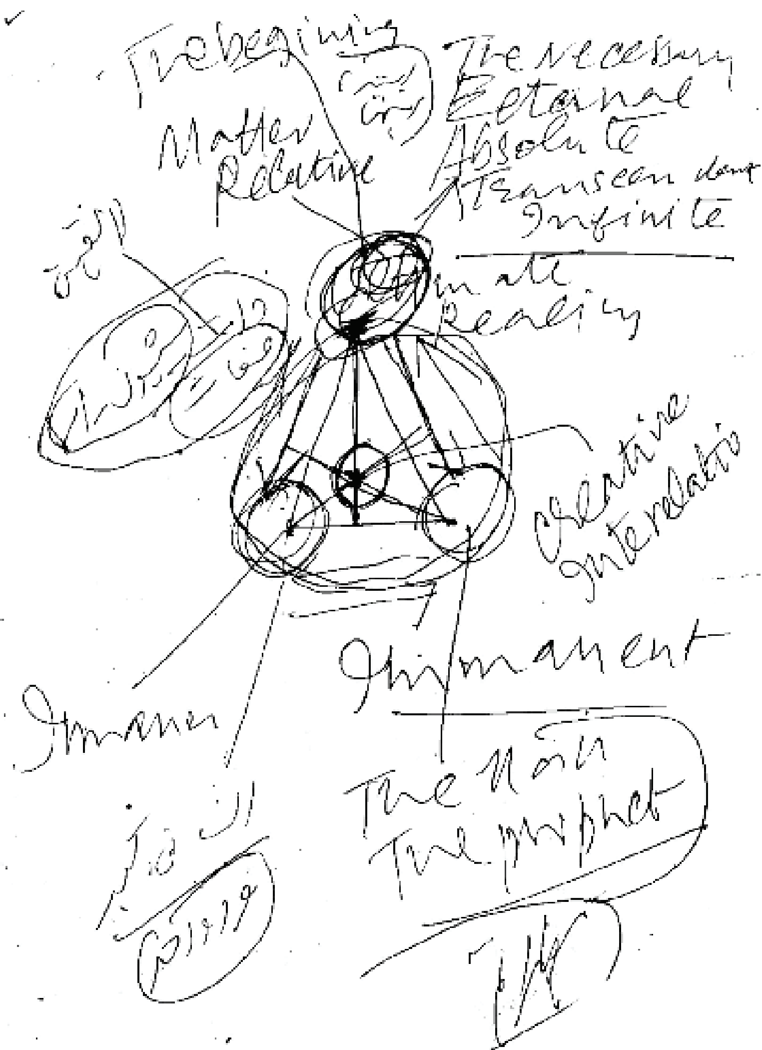
بس اللہ میاں منزل یاب فرما دیں۔ منزل پر پہنچے ہوئے کو بحث نہیں کرنا ہوتی اور جو نہیں پہنچا وہ صرف بحث کر سکتا ہے۔ اگر کوئی حقیقت کو live کر رہا ہے تو اسے بحث مباحثے میں پڑنے کی کہاں فرصت!

بس حقیقتِ محمدیہ کی citizenship لے لیں کیونکہ atlas لکھتے رہنے سے کیا حاصل ۔ کسی چیز کو جاننے کا کیا فائدہ اگر وہاں پہنچے نہیں ۔ جاننا کام نہیں آتا بلکہ پہنچنا کام آتا ہے ۔ اگر خود سے نہیں پہنچ پا رہے تو کسی کو کہہ دیں کہ وہ آپ کو پہنچا دے ۔ کسی کے ہاتھ میں تو آ کے دیکھیں ۔ ہماری I-ness کسی اور کے ہاتھ میں آنے کو تیار نہیں ہوتی ۔ خود سے اگر کوئی منزل پر پہنچ بھی گیا تو یہ کیسے طے ہوگا کہ یہ آخری بلندی تھی ؟ جسے آج کل خود اعتمادی کہا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے سیڑھی نمبر پانچ پر ہیں اور میں سیڑھی نمبر پانچ سو پر ۔ بھئی یہ تو کوئی اور بتائے گا کہ آپ پانچ سو نمبر والی سیڑھی پر ہیں یا نہیں ، اور اگر ہیں تو آگے والی سیڑھیوں سے وہ آپ کو آگاہ کرے گا ۔

بنمائے بصاحب نظرے گوہرِ خود را

عیسیٰ نتواں گشت بتصدیقِ خرے چند

لیکن اس پر کچھ ذہین اعتراض کرتے ہیں کہ یہ تو تقلید ہے ۔ تصدیق کرانے کو تقلید نہیں کہتے ۔ Attestation سے کیا خودی کہیں چلی جائے گی ؟! مدارِ کار تصدیق پر ہے اور تصدیق آپ سے بڑے والا کرے گا ۔ اگر وہ کہہ دے کہ آپ بڑے ہیں تو اس کے کہے سے یہ establish ہوگا کہ آپ بڑے ہیں ۔ جب تک جوہری کا فیصلہ ساتھ نہ ہو قیمتی سے قیمتی پتھر بھی نہیں بِکتا ۔ چٹانوں میں عقیق نیلم ہوتے ہیں لیکن دھیلے کے بھی نہیں ہوتے ۔ جب کوئی انہیں نکالے گا اور تراشے گا تو پھر ان کی قیمت لگے گی ۔ ابی قحافہ سے ابوبکر صدیقؓ ہونے تک کا سفر کوئی طے کروائے گا تو طے ہوگا ۔ علویت سے کرّاریت تک کا سفر تو کسی کے زیرِ سایہ طے کرنا پڑے گا ۔ ایسے کیمیا گر کے ہاتھ میں جانا چاہیے جو مٹی کو سونا بنا دے ۔ جس آدمی کو کسی کے ہاتھ نہیں لگے وہ کسی کام کا نہیں ۔ اگر شیخ سے تربیت کروالی ہے اور تربیت ہوگئی ہے تو پھر حقائق سمجھ میں آئیں گے ۔ علوم آدمی کے کام نہیں آتے بلکہ اپنے ربّ سے تعلق کام آتا ہے ۔ علم تو بہت ہو مگر تعلق نہ ہو تو کیا فائدہ ایسے علم کا ۔ پھر ایک اور بات بھی ہے کہ میرا تو جنابِ حق تعالیٰ سے تعلق ہو لیکن کیا ان کا بھی مجھ سے تعلق ہے ۔ اور آخری فیصلہ کن چیز تو یہ ہے کہ میں اُن کی نظر میں کیا ہوں ۔


The beginning
The necessary
Eternal
Absolute
Transcendant
Infinite
Matter
Relative
Ultimate Reality
Creative
Immanent
The prophet

باب ششم

جدید مغربی افکار

۱۔ رزق کا مسئلہ دراصل بسط و قدر کا مسئلہ ہے۔ مغربی علوم نے تو ساری بات وسائل اور عاملینِ پیدائش میں محدود کر رکھی ہے۔ لیکن ہمیں رزق کی تنگی فراخی کو دینی اعتبار سے سمجھنا ہے۔ معاشیات کے مغربی نظریات صرف مادی اسباب سے متعلق ہیں۔ روحانی اسباب اور پھر خالقِ اسباب کو گفتگو سے minus کر دیا گیا ہے۔ مغرب کے پاس مادی اسباب اور وسائل تو بے شمار ہیں اور planning بھی بہت زیادہ لیکن درپیش مسائل بھی بے انتہا ہیں۔ اگر وسائل اور planning سب کچھ ہوتا تو مسائل کیوں جنم لیتے؟ قرآنِ کریم تو روحانی اسباب پر زور دیتا ہے۔ جنابِ حق تعالیٰ تو فرماتے ہیں کہ اگر استغفار کرتے تم لوگ تو ہم رزق کے دھانے کھول دیتے۔ آپ ﷺ نے یہ تعلیم فرمائی کہ رزق کی تنگی توبہ نہ کرنے کا منطقی نتیجہ ہے۔ یہ بات نہ ہمارے معاشیات دان کرتے ہیں اور مغرب والوں نے تو خیر کیا کرنی۔ مغربی اور پھر مغرب زدہ معاشیات دانوں نے روحانی سببیت کا تو لفظ ہی اڑا دیا ہے اور سارا زور مادی اسباب اور system پر ہے۔ اسباب پرستی یعنی مادیت زدگی سر کو چڑھی ہوئی ہے۔ خود لفظِ system میں خلل ہے کیونکہ اس میں میکانکی عنصر شامل ہے اور پھر بات صرف 'بیرون' یعنی external physical world میں reduce ہو جاتی ہے۔ اسلام نے معصیت شعاری کو رزق کی تنگی و فراخی کا حقیقی سبب بتایا ہے۔ معصیت شعاری اور پھر توبہ نہ کرنا یہ دو اسباب ہیں تنگی کے اور دونوں روحانی اسباب ہیں۔ Post Renaissance تمام مغربی علوم میں سے روحانیت کو خارج کر دیا گیا۔ مذہب نے تو گناہ اور سرکشی کو مادی اور جسمانی بے قراری کا سبب قرار دیا۔ پھر یہ کہ رزق کی تنگی اور فراخی میں جنابِ الحکیم کی حکمتوں کا سلسلہ ہے۔ سلسلہ در سلسلہ ایک عمل ہے۔ حکمتوں کی حکمرانیوں اور حکمرانیوں کی حکمتوں کے سلسلے ہیں۔ ہمہ شتگی کی صورتِ حال ہے۔ کبھی غربتیں حق تعالیٰ کا انعام تو کبھی تموّل۔ لیکن اب تو criterion ہی بگاڑ دیا گیا ہے۔ مغرب کی غلامی میں حقائق سے نظریں پھیر لی ہیں۔ اب ہمارے دانشور بھی مغرب کے سانچوں میں بات سمجھتے سمجھاتے ہیں یعنی بات ہماری اور سانچے اُن کے۔ اب تو کسی کو مغربی سانچے توڑنے کی بھی

توفیق نہیں۔ مغرب نے عمرانی علوم کو بھی میکانکی علوم بنا دیا ہے۔ لگے بندھے سانچوں میں بات کو زبردستی فِٹ کرنے کی ذہنیت نے تمام علوم سے تخلیقی عنصر ختم کر دیا ہے۔ معاشیات بھی فقط ایک static and mechanic علم بن کے رہ گیا ہے جبکہ اسے fixed علم نہیں سمجھا جانا چاہیے بلکہ اسے creative ہونا چاہیے۔ لفظِ نظام نے ہر علم کو narrow and shallow کر دیا ہے۔ ذرائع اور وسائل کی بحث معاشیات کا بنیادی موضوع ہے۔ اِنہیں اختیار تو کرنا پڑے گا لیکن ایک ہے عاملینِ پیدائش اور ایک ہے ان کی ترتیب و تنظیم۔ ترتیب و تنظیم اپنے تخلیقی عمل کے دوران نئی شکل اختیار کرتی ہے چنانچہ تخلیقی پیچیدگیوں سے عہدہ برآ ہونے کی جدوجہد بھی کرنی ہے۔ لیکن جدید معاشیات اپنے rigid نظام کے محدود دائروں میں قید ہے اور نظام سے یہ تأثر پیدا ہوتا ہے کہ وسائل انسان کے قابو میں ہیں جبکہ یہ سوچ لادینیت ہے۔ لفظِ نظام کی نفی کرنی چاہیے۔ ایک ہے معاشی سانچوں کی تشکیل اور ایک ہے اس کے نظری پہلو۔ بدلتی ہوئی صورتِ حال کے مطابق ذرائع معلوم کرنے کی تخلیقی جدوجہد کرنی ہوگی۔ معاشی مسائل کوئی مشینی نہیں بلکہ وہ زندہ انسانوں کے مسائل ہیں۔ انفاق فی سبیلِ اللہ کا عنوان معاشیات سے اُڑا دیا گیا ہے۔ آیاتِ مبارکہ اور احادیثِ مبارکہ میں اکتسابِ زر کی تعلیم نہیں دی گئی۔ اسلامی معاشی نظم و انتظام کی روح تو انفاق ہے۔ آیات و احادیث میں اکتسابِ زر نہیں بلکہ انفاق پر زور دیا گیا ہے جبکہ جدید علمِ معاشیات کے تمام مکتبِ فکر اکتسابِ زر کے گرد گھومتے ہیں۔ آیتِ مبارکہ ہے کہ لن تنالوالبِرَّ حتیٰ تنفقوا مما تحبُّون۔ اس آیتِ مبارکہ میں لفظِ انفاق صرف زر و مال پر نہیں آیا بلکہ محبوب ترین چیز کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہاں خدا سے مراد بندگانِ خدا ہیں ورنہ خدا کو تو کوئی چیز نہیں پہنچتی۔ موجودہ معاشی نظام اور نظریات میں یہ موضوع ہی نہیں رہا۔ عاملینِ پیدائش، ذرائع اور وسائل بس انہی اصطلاحات میں بات گھومے جا رہی ہے۔ یہ احیائے علوم کے نتائج ہیں۔ اور احیائے علوم دراصل تدفینِ علوم ہے۔ ساری بات زاویۂ نظر کی بحث ہے۔ جدید علوم کے علمبردار اُس جگہ جا کھڑے ہوئے ہیں جہاں سے سارا نقشہ ہی different دکھائی دیتا ہے۔ جب اصل platform ہی چھوڑ دیا ہو تو منظر صحیح کیسے نظر آ سکتا ہے! منظر کو دیکھنے کے لئے بلندی پر جانا ہوتا ہے۔ چیزیں جس سطح پر ہوں اُس سطح پر رہ کر نہیں دیکھی جا

سکتیں۔ احیائے علوم نے نہائت غلط سوچ پیدا کر دی کہ جہاں کی چیزیں دیکھنا ہوں، اُسی جگہ پر رہ کر دیکھتے ہیں اور system پر اتنا زور کہ اسے غیر متبدل سمجھ لیا گیا ہے۔ مغرب کا معاشی نظام بھی ہمارے سامنے ہے۔ امریکہ کا کُل معاشی نظام کیا ہے؟ اُن کا معاشی structure اور media کِن کے ہاتھ میں ہے؟ پورا مغرب اور امریکہ تل ابیب کا اغوا برائے تاوان کا کیس ہیں۔ پچانوے فیصد کی معاشی تقدیر پانچ فیصد یہودیوں کے ہاتھ میں ہے۔ کُل معاشی نظام stock exchange ہے۔ سب قارونیت کی کہانی ہے جسے آج اقتصادی عوامِل کا نام دیا ہوا ہے۔

کوئی طوفان آ نہ جائے کہیں
آج کل پھر ہوا دباؤ میں ہے

گرد اُٹھتی ہے پھر گناہوں کی
فصل گندم کی پھر کٹاؤ میں ہے

دوسروں کی عینک چڑھا کر جب منظر دیکھا جاتا ہے تو سب بدل جاتا ہے۔ عینک اگر سرخ ہے تو پورا منظر ویسا ہی دکھائی دے گا۔ مغرب کے نظریات مختلف رنگوں کے goggles ہیں۔ عواملِ پیدائش کو بنیاد بنانا کفر کی بات ہے۔ ارادۂ ربانی عوامل ہے۔ انسانی اختیار میں تو چھینک بھی نہیں تو نظامِ دہر کا مالک کیسے ہو گیا! سارا کرّہ ٔ ارض سمگلروں کے ہتھے چڑھا ہوا ہے، اب پتہ نہیں اِن کا معاشی نظام اور planning کہاں ہے!

۲۔ نشاۃِ ثانیہ (The Renaissance Age) کا آغاز چودھویں صدی سے ہوا اور اٹھارویں اور انیسویں صدی میں یہ تحریک اپنے climax پر تھی۔ یہ تحریک دراصل پرانی روایتوں سے انحراف تھا جس سے سارے فکری و عملی رویوں میں Graeco-Roman Culture جاری و ساری ہو گیا۔ پورے مغرب میں پانچویں صدی عیسوی سے تیرہویں صدی تک فکری و عملی صورتِ حال اور تھی لیکن نشاۃِ ثانیہ کے بعد یورپ والے قرونِ وسطیٰ کی فکری و عملی روایت

سے مختلف ہی نہیں بلکہ مخالف چلے ہیں۔ The Medieval Age کی سوچ اور فکر کے مقابل نئے رویے لے کر آئے۔ پہلے مرکزی لفظ خدا تھا لیکن نشاۃِ ثانیہ والے human کا لفظ لائے۔ اگر انسان کو مرکز مان لیا تو اس کا مفہوم تو یہ ہوا کہ انسان خود اپنا خدا ہے۔ پہلے فطرت سے ہم آہنگی کا اصول تھا لیکن نشاۃِ ثانیہ کے بعد ہم آہنگی کی جگہ conquest of nature آ گیا۔ اور جب یہ بات سائنس میں بھی آ گئی تو پھر فطرت پرستی نے جنم لیا۔ پہلے خدا غیر متبدل تھا لیکن سائنس نے laws of nature کو غیر متبدل کہا اور اسی کا ابلاغ کیا۔ اور پھر بات انسان پرستی تک آ گئی یعنی تعقل کو اتنی اہمیت دے دی گئی کہ اسے اپنا خدا بنامِ Rationalism بنا لیا گیا۔ انسان کی روحانی پیاس کو پسِ پشت ڈال کر سارا زور انسان کی جبلتوں کی تسلی تشفی پہ دیا گیا۔ کسی دانشور نے انسان کو عقل کہا تو کسی نے جبلت یعنی کبھی تعقل کی غلامی تو کبھی انسانی جبلتوں کی۔ پھر سائنس نے اپنی ایجادات کی ایسی دھاک جمائی کہ انسان نے خود اپنی مخلوق کو اپنا خالق بنا لیا۔ لفظِ خدا اور وحی کی جگہ سائنس کو رکھ لیا گیا۔ پھر Humanism کا مذہب اختیار کر لیا گیا۔ Science اور Humanism کا مقصد تو ایک ہی ہے اور وہ ہے انسان پرستی اگرچہ نام اسے انسان دوستی کا دیا جاتا ہے۔ Humanism کا صاف اور سیدھا مفہوم تو یہ ہے کہ انسان اپنی کسوٹی آپ ہے اور انسان کے انسان ہونے کے معنی ہیں انسان کے جبلی تقاضے۔ خدا شناسی کا نام انسان نہیں بلکہ جبلی تقاضوں کی تکمیل کا نام ہے انسان۔ پھر غیبیات کو فرضیات بنا دیا گیا یعنی وحی، جنت، دوزخ، ملائک، عرش، کرسی ان تمام حقائق کو suppositions and assumptions قرار دے دیا۔ اس کو احیائے علوم کہا جاتا ہے جو کہ درحقیقت تدفین ہے علوم و معارف کی۔ عہدِ متوسط کے بالعکس یہ روشن خیالی آئی جو درحقیقت خیالی روشنی ہے۔ الہامی یا نبوی عقل پر نہیں بلکہ انسانی عقل پر چلنے کو اپنایا گیا۔ God کی جگہ Reason نے لے لی اور یوں بات کو مزید shallow کر لیا جب scientism and experimentalism کی غلامی اختیار کر لی گئی۔ جسے آج تاریک دور (The Dark Ages) کہا جاتا ہے کیا اس وقت یورپ میں کوئی تہذیب نہیں تھی؟ ایسا نہیں ہے۔ اُس دور کے متکلمین بڑے لوگ تھے کیونکہ منکرِ خدا نہیں تھے۔ اُسی دور میں اسلام اپنے عروج پر تھا۔ وہ دور تو علم و تہذیب کا بلند ترین دور تھا۔ پھر Chinese اور

Hindu تہذیبیں بھی تھیں اور ان کے علوم بھی بہت بلند تھے۔ اس وقت عقل، نفس اور خواہشات کی خدائی نہیں تھی اگر چہ سائنس اس وقت بھی تھی۔ خود Christian Theology میں بلند درجے کی Metaphysics تھی۔ اس وقت کے متکلمین بھی اخلاقیات سکھا رہے تھے۔ تو اب یہ بات سوچنی چاہیے کہ کیا وہ علوم نہیں تھے؟ لیکن جدیدیت نے اس عہد کو تاریک دور کا نام دیا کیونکہ اسے تاریک کہہ کر ہی ان کی بات سنی جا سکے گی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ احیائے علوم ایک بانجھ پن ہے جس میں جہل کو علم اور بلادت کو فہم کہا گیا۔ بے خدا تو نیوٹن بھی نہیں تھا لیکن نشاۃِ ثانیہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ بات بے خدا ہونے کی طرف جا نکلی۔ خدا سے دور لے جانے کا خانہ سائنس میں نہیں تھا لیکن انسان پرستوں نے اسے بے خدا بنا لیا ورنہ قرونِ وسطیٰ کے سائنسدان تو خدا کو مانتے تھے۔ نشاۃِ ثانیہ کا net-result یہ نکلا کہ جو چیز ہمارے تجربے میں نہیں آسکتی وہ ہے ہی نہیں یعنی نامعلوم مساوی ہے ناموجود کے۔ جدید علوم تو احیائے علوم کا شاخسانہ ہیں اس لئے بے خدا ہونے کو علم کہا جا رہا ہے جبکہ یہ جہل اور حماقت کی انتہا ہے۔ اور ہم آج مغرب سے اتنے مرعوب ہیں کہ ان کے علوم کو وحی سمجھ کر مان لیتے ہیں۔ سائنس کی دھاک اتنی بیٹھ چکی ہے کہ اب مذہبی حقائق کو سائنس کی روشنی میں سمجھنے سمجھانے کی روش جڑ پکڑ چکی ہے۔ ہمیں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اسلام واحد حقیقت ہے کہ جو عین عقل اور فطرت ہے بلکہ اسلام، عقل اور فطرت ایک چیز ہیں۔ جو چیز غیر اسلامی ہوگی وہ یقیناً غیر عقلی اور غیر فطری ہوگی۔ ہر وہ سوچ جو بے خدا ہے یا اسلام کے منافی ہے وہ بدترین جہل اور بدفطرتی ہے۔ انسانی فطرت احسنِ تقویم ہے اور اسفلَ سافلین انسانی فطرت نہیں۔ انسان جب بے خدا ہو کر چلتا ہے تو وہ خود کو پستیوں میں گرا لیتا ہے اور خود کو پستیوں میں گرا لینا انسانی فطرت نہیں۔

باب ہفتم **آدابِ زیست**

۱۔ لفظِ بلند ہمتی کا کوئی نعم البدل نہیں۔ فیضان سے کچھ ہوتا ہے نہ جذب و مستی سے اور نہ ہی انس و ہیبت سے۔ جب تک تساہل اور کاہلی موجود ہے تب تک کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ Time scheduling کریں۔ چوبیس میں سے چار گھنٹے تو خلوت بحق میں گذاریں اور باقی بیس گھنٹے دوسرے مسائل پہ صرف کرلیں۔ خلوت بحق کے لئے آرام پسندی کے ساتھ ایک خاص مُخاصمت کرنا پڑتی ہے۔

۲۔ اسباب خالقِ اسباب کے ہاتھ میں ہیں یعنی فاعلِ حقیقی تو جنابِ حق تعالیٰ ہی ہیں۔ مکمل عارِف اسباب کی ساری باریکیوں پر بھی نگاہ رکھتا ہے اور انہیں اختیار بھی کرتا ہے کیونکہ اختیارِ اسباب میں توکُّل زیادہ ہے اور رازِ توحید بھی۔ اسباب اختیار کئے بغیر توکُّل کرنا آسان ہے۔ اسباب اختیار کئے ہونا اور نتائج کا حاصل ہو جانا، پھر صدقِ دل سے یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے، یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ اسباب اختیار کرنا آپ ﷺ کی سنّتِ مبارکہ ہے۔

۳۔ انسانی شخصیت ایسا پیچیدہ معاملہ ہے کہ مقاصد جس طرح مرضی ترتیب پا جائیں، ذہنی، جذباتی chemistry پہلے ہی کی طرح کام کرتی رہتی ہے حالانکہ تبدیلی اس میں واقع ہونی چاہیے۔ آدمی منقسم رہتا ہے۔ بازیچۂ اضداد رہنے کی صفت انسان کی بہت عجیب ہے۔ جذبے اور تخیّل کی وابستگی کسی اور سے ہے اور روح کی کسی اور سے۔ معتقدات اور طرح ہوتے ہیں اور احساسات کسی اور طرح۔ کتنی عجیب بات ہے! یہ multi-beloved system ہے جبکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ لا الٰہ الا اللہ اور لا معشوق الا اللہ۔ اور صرف روح کے نہیں بلکہ انسان کے اندر اور باہر کی ہر ہر چیز کے وہ واحد معشوق ہوں۔ آیتِ مبارکہ ہے کہ اللہ نے کسی انسان کے جوف (سینہ) میں دو دل نہیں رکھے۔ اگر دل کا واقعی کوئی محبوب ہوتا ہے تو وہ بس ایک ہوتا ہے۔

۴۔ شفاعت سے آخرت میں نجات حاصل ہو جائے گی لیکن اسے بدمعاشیوں کا license نہ بنائیں۔شریف آدمی کے لئے اس سے بڑی کوئی سزانہیں کہ اسے جرم کی سزا نہ دی جائے۔ جنابِ حق تعالیٰ کے تعلق میں حسنِ ظن اور حیا اختیار کریں۔ دین سے اگر شرافت اور حیا ہی نہیں آئی تو کیا فائدہ!

ہفت دوزخ در نہاد از شرمساری مضمر است
انتقام است ایں کی با مجرم مدارا کردہ ای

۵۔ آدمی کے اندر اور باہر دو مرضیوں کا نظام ہے۔ایک بندے کی مرضی اور ایک مولا کی مرضی۔اگر دونوں tally ہو جائیں تو اسے خوشی کہتے ہیں۔اور اگر دونوں میں ٹکراؤ ہو تو اس کا نام ہے امتحان، آزمائش اور مصیبت۔اب اگر ٹکراؤ ہو تو اپنی مرضی چھوڑ دیں۔جب دو مرضیاں ایک ہو جائیں تو پھر خوشی ہی خوشی ہے۔اتنا سبق لے لیا تو توحید سیکھ سمجھ لی۔تقدیر سے مراد ہے مرضیٔ مولا! لیکن اب لوگوں نے لفظِ تقدیر کے معنی بگاڑ لئے ہیں۔ بڑے پیر صاحبؒ دس بیس فقروں سے زیادہ وعظ نہیں فرماتے تھے۔وہؒ اپنے مواعظ میں اکثر یہ فرماتے کہ

یا غلام (اے بیٹے)! تقدیر سے جنگ چھوڑ دے۔
یا غلام (اے بیٹے)! تقدیر سے موافقت کرلو۔

۶۔ جس میں غیرتِ شرع نہیں وہ تو کم سے کم ایمان کی بات نہ کرے۔اب لوگ رسوم و رواج کو دین بنائے ہوئے ہیں۔ یہ فیصلہ کریں کہ خدا اور رسولِ خدا کا follower بننا ہے یا خلقِ خدا کا؟! فاتحہ خوانی، کلام بخشنا، شادی بیاہ کی رسومات ان تمام بدعات کو توڑنا ہے۔انسان وقت پر بات کرے لیکن مہذب مگر پرقوت انداز میں۔ مجھ سے بہت گناہ ہوئے اور آگے بھی ہوں گے لیکن شرعِ رواجیہ پہ کبھی نہیں چلوں گا کیونکہ شرعِ رواجیہ یعنی رسوم و رواج کی تقلید کو جب شرعِ نبویہ سمجھا جائے گا تو یہ گناہِ عظیم ہے۔تھوڑی سی جرأت کریں گے تو رسومات شکنی ہوسکتی ہے۔انتہائی پیار، عقل اور

قوّت سے بات کرنی چاہیے اور قوّتِ قلبیہ بھی خرچ کریں، اگر قلب میں کچھ ہے۔ حدیثِ مبارکہ کے الفاظ ہیں کہ الحبُّ للہ والبغض للہ یہ اصول تو اب ہم بھولے ہوئے ہیں اور تصوف والوں نے تو بُغضُ للہ کا خانہ ہی نکال دیا ہے۔ محبوب کی محبت میں اگر کسی کی دشمنی نہیں خرید سکتے تو وہ محبت ہی نہیں۔ ایک کو اپنانے میں لاکھوں سے تعلقات ٹوٹتے ہیں۔ مولانا محمد علی جوہرؒ کے قلب سے یہ شعر نکلا کہ

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

مسئلہ سیدھا اور صاف ہے کہ جس مستحب کو فرض یا واجب کا درجہ دے کر پڑھا جائے گا تو وہ بدعت ہے۔ ساری بدعات ایسے ہی شروع ہوتی ہیں۔

۷۔ روزہ کی حقیقت یہ ہے کہ اپنے حواس کو قابو میں رکھنا آ جائے۔ حضور داتا صاحبؒ نے کشف المحجوب میں روزے کی حقیقت پہ تحریر فرمایا کہ احبِس حواسِکَ یعنی روزہ نام ہے اپنے حواس کو قابو میں لانے کا۔ ظاہری حواسِ خمسہ جلد انسان کے قابو میں نہیں آتے۔ ویسے حضرتؒ نے حواسِ ظاہری کی قید نہیں لگائی بلکہ حواسِ باطنی بھی اس میں داخل شامل ہیں۔ مراقبہ بھی اسی لئے کیا جاتا ہے کہ حواس کو قابو میں لایا جائے۔ سب سے بڑا مسئلہ آجکل اپنے تخیّل کی آوازوں کو قابو میں لانے کا ہے۔ جس نے یہ سیکھ لیا اس کا اسّی فیصد کام ہو گیا۔ آجکل نیّتوں ارادوں کی درستگی سے بھی زیادہ اہم اور ضروری کام اپنے تخیّل پہ قابو پانا ہے۔ حواسِ خمسہ مسلسل اپنا کام کر رہے ہیں جس کی وجہ سے اندر فلم بندی ہو رہی ہے۔ جو فلم سازی ہم نے خود کی ہے وہ تخیّل کی سکرین پہ تو چلے گی۔ محفل بازیاں ترک کر دیں، فضول گھومنا پھرنا بند کر دیں اور فضول کتابیں بھی نہ پڑھی جائیں۔ Irrelevant questions میں بالکل involve نہ ہوں۔ تنہائی اور خامُشی کی اور کسی خیال پر نظر جمانے کی عادت ڈالیں۔ کام نظریں ہٹانے سے نہیں ہو گا بلکہ نظریں جمانے سے ہو گا۔ ہر وقت یہی روتے رہنا کہ تنخواہیں نہیں بڑھیں، فلاں نے یہ کہہ دیا، فلاں نے یہ کر دیا، ان تمام لا

یعنی خیالات وافکار سے چھٹی لے لیں۔تعقُّلات جو ہیں یہ تخیُّلات سے بھی زیادہ خطرناک ہوجاتے ہیں یعنی ہروقت عقل کی بھاگ دوڑ میں لگے رہنا اور فلسفہ طرازیوں میں گم رہنا۔حقائقِ غیبیہ کو feel کریں پھر تخیل کی آوارگی سے جان چھوٹے گی۔نماز پڑھتے وقت یہ دھیان میں رہے کہ معراج پہ جارہا ہوں یہ نہیں کہ معراج کا فلسفہ کیا ہے۔حضور باواصاحبؒ اس طرح مراقبہ فرماتے تھے کہ مسلسل خلا میں دیکھتے رہتے۔اوراب یہ کہا جاتا ہے کہ کنوئیں میں لٹکے رہے تھے یعنی (نعوذُباللہ) نہ کوئی ذکر ذکار، نہ فرائض وواجبات اور نہ ہی مریدوں کی کوئی تربیت کا احساس!

۸۔ تصوف بس یہی ہے کہ ہم جھوٹی شان چھوڑ دیں۔جب اس بات پر آگئے کہ اپنا تو ہے ہی کچھ نہیں تو پھر کوئی بھی کام کرنے میں ہمارا کیا جائے گا۔سارے صحابہ کرامؓ کا اپنا اپنا کوئی معاشی پیشہ تھا۔اسلام تو دنیا اور آخرت کا تضاد مٹاتا ہے تو پھر دنیا وآخرت کے تضاد کی بحث ہی کیوں! بعثت کا کارنامہ یہی ہے کہ دنیا اور آخرت کے تضاد کی غلط فہمی کو مٹا دیا۔یہی انقلابِ رسالت ہے۔ صحابہ کرامؓ نے کون سا کام نہیں کیا! کیا گورنر نہیں رہے اور تجارتیں نہیں کیں؟ کیا انہوں نے کاشتکاری اور پہلوانی نہیں کی؟ وہ کون سا کام ہے کہ جوانہوں نے نہیں کیا جسے آج دنیا کا کام کہا جاتا ہے۔اُنؓ کے بیوی بچے بھی تھے، انسانوں میں بھی رہے ہیں اور زہد وتقشّف کے لوگ بھی ہیں۔سیّدنا ابوذر غِفاریؓ کو جو کچھ صحرا میں ملا ہوا ہے وہی جنابِ حضرت عمرؓ کو تختِ شاہی پر ملا ہوا ہے۔دنیا اور آخرت کے تضاد کا جو غلط رویہ پھیل چکا تھا اسے آپ ﷺ نے جلا کر اُڑا دیا۔

۹۔ دین کا تقابل دنیا سے نہیں ہے بلکہ دین وہ ہے جو دنیا اور آخرت کے رابطوں کی نوعیت کو واضح کرتا ہے اور آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتا ہے اور پھر دنیا وآخرت کے مالک کو سبھی پر ترجیح دیتا ہے۔آدمی کو نہ طالبِ دنیا بننا ہے اور نہ ہی طالبِ آخرت، بلکہ طالبِ حسنہ بننا ہے اور حسنہ کا تعین سورۂ احزاب میں کر دیا گیا۔لقد کان لکم فی رسولِ اللہِ اسوۃ حسنہ۔حسنہ آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس میں منحصر کر دی گئی تو بھلائی کا معیار دنیا وآخرت میں صرف اور صرف

آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس ہے۔طلبِ حسنہ ہی دین ہے یعنی طالبِ مولا ہونا۔اس کے لئے اپنی جان لڑا دیں جسے قرآنِ کریم میں حقَّ تُقٰتہ کہا گیا ہے۔

۱۰۔ شوہر اور بیوی کا رشتہ حاکم اور محکوم کا رشتہ نہیں ہے۔ دونوں کا دائرۂ فکر وعمل علیحدہ ہے، کوئی برتری یا کمتری کی بحث نہیں۔لیکن شدید اختلافی اُمور میں veto کا حق شوہر کے پاس ہے۔قرآنِ کریم میں تو دونوں کو ایک دوسرے کا لباس کہا گیا ہے۔اسی لفظِ لباس سے تعلق کی نوعیت کو سمجھیں۔شرعی طور پر بیوی کے سامان یعنی جو کچھ بھی اس کی ملکیت ہے اس میں شوہر کے والدین، بہن، بھائی وغیرہ کو تصرُّف کا کوئی حق نہیں۔ یہ فقہی استحقاق بھی شوہر کو حاصل نہیں کہ بیوی ضرور ہی اسے کھانا پکا کر دے اور گھر کی صفائی کرے بلکہ بیوی کو پکی پکائی روٹی کھلانا شوہر کی ذمہ داری ہے۔ کپڑے وغیرہ سے متعلق بیوی شوہر کی معاشی صورتِ حال کے مطابق حقدار ہے۔ یہ شرعی ذمہ داری بھی بیوی پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنا standard of living شوہر کی آمدنی کے مطابق رکھے۔شوہر اور بیوی ایک دوسرے کے ولی ہیں یعنی comrades ہیں۔اجرِ دنیا اور اجرِ آخرت جنابِ حق تعالیٰ دونوں کو مساوی دیتے ہیں۔

۱۱۔ لوگ اب رہنے سہنے کے آداب نہیں سیکھے ہوئے، اس لئے اپنے لئے اور دوسروں کے لئے بہت مسائل تخلیق کرتے ہیں۔کوئی کام کرنا ہو تو پہلے تھوڑے کام سے شروع کریں، پہلے اسے اچھی طرح establish اور consolidate کریں۔ فتح پانا آسان ہے لیکن فتح کو consolidate کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اب ہمارے ہاں زیادہ تر صرف dream merchandization ہوتی ہے جسے ambition کہہ اور سمجھ رہے ہوتے ہیں۔کام کا out put ہونا چاہیے اور وہ quantity and quality wise ہو۔روز کا حساب رکھنا چاہیے کہ آج کیا کھویا اور کیا پایا۔وقت بڑی ظالم چیز ہے، بہت تیز رفتاری سے گزر جاتا ہے۔ یہ مسئلہ نہیں کہ وقت لوٹ کر نہیں آتا بلکہ اس وقت میں جو کام کرنا اور ہونا تھا وہ مہلتِ عمل دوبارہ میسر نہیں آئے گی۔اس کو

لفظِ خُسر کہا ہے قرآنِ کریم نے۔ انَّ الانسانَ لفی خسر۔ سونے سے پہلے انسان اپنا محاسبہ کرے کہ آج کے دن مَیں نے کیا کِیا۔ کتنا کام آج کے دن کیا۔ وقت تو ایک مشین ہے، بے جان مشین۔ اب اس کو بیکار رکھو یا اس سے کچھ حاصل کرو، یہ انسان کو اختیار حاصل ہے۔ اور یہ مشین بھی ایسی ہے کہ نہ گھستی ہے اور نہ ہی load-shedding ہوتی ہے۔ یاد رکھیں کہ سرور آئے نہ آئے لیکن جو روزانہ کا کام ہے وہ تو کرنا ہے۔ سرور تو profit کے تصور سے آئے گا۔ کام لذت کے لئے نہیں ہوتے، نفع کے لئے ہوتے ہیں۔ تصورِ نفع کا سرور لینا ہے۔ روحانی اور معاشی کام سبھی کی حقیقت یہی ہے۔ پہلے جسم کتنی تکلیف اٹھاتا ہے تب اسے راحت ملتی ہے۔ یہی اصول دماغ اور روح پر بھی apply ہوتا ہے۔ اس بات کو آدمی ہر وقت مدِ نظر رکھے کہ quantity of production کتنی ہے اور quality of production کتنی۔ پھر یہ کہ کام کس کے لئے کر رہا ہوں، کیا خدا کے لئے کر رہا ہوں یا اپنے نفس یا والدین کے لئے کر رہا ہوں؟ بندہ جس کے لئے کام کر رہا ہوتا ہے وہی محرکِ عمل ہوتا ہے جسے نیت کہتے ہیں، اور اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

۱۲۔ Patience اور endurance جس آدمی میں نہیں ہے وہ کسی معاملے میں نہیں چل سکتا، روحانیت میں بھی نہیں چل سکتا۔ کئی کاموں میں speed بہت خطرناک ہوتی ہے۔ رفتار maintain کرنا پڑتی ہے۔ بس! 'Wait and see!'۔ یاد رکھیں کہ conflicts and paradoxes تو ہر آدمی کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ آخر ہر ایک کی سوئی کچھ نہ کچھ fluctuate کر ہی جاتی ہے۔ لیکن فیصلہ in the end انسان نے ٹھیک کر لینا ہوتا ہے، اس لئے ذرا صبر سے کام لیں اور جلد بازی نہ کریں۔

۱۳۔ حزبُ اللہ میں بے وردی ہونے کے کیا معنی! یعنی شعائرِ اسلامی کا اختیار نہ کرنا۔ اور اب دین میں شعائر کی پابندی کا فلسفہ پوچھتے ہیں جبکہ آرمی کے اصول وضوابط کا فلسفہ کبھی کسی نے نہیں پوچھا۔ اگر ہم کسی دینی معاملے میں touchy اور sincere ہیں تو سبھی کو پتہ چل

جائے گا اور پھر کوئی سوال نہیں کرے گا۔ دین کی ہر بات اختیار کرنی ہے اور دین کی ہر بات عظیم اور خوبصورت ہے۔ اختیار بھی کریں اور اس پر فخر وانبساط بھی ہو۔ وردی پر ناز کیجئے۔ ہاں ٹھیک ہے کہ میں نیچ ہوں لیکن بس وردی پہنادی گئی تو پہنادی گئی اور اس designation پر پورا ناز ہو آدمی کو۔ اللہ کو جس صورت، جس posture پر پیار آرہا ہو تو اس سے بہتر بھی کچھ ہوسکتا ہے!؟ بس سمجھ ٹھیک ہونی چاہیے۔ سمجھ کے ٹھیک ہونے کا نام حضوری ہے۔ جس کی جیب میں blank cheque ہو تو کوئی اسے جو کچھ مرضی کہہ لے وہ بس ہنس دے گا اور یہ بھی نہیں بتائے گا کہ میری جیب میں blank cheque ہے۔

مِری طلب بھی اُنہی کے کرم کا صدقہ ہے

قدم یہ اُٹھتے نہیں ہیں اُٹھائے جاتے ہیں

۱۴۔ دنیاوی خواہشات کی تکمیل کے بغیر مطمئن نہ ہونے کا جو اصول ہم اختیار کئے ہوئے ہیں اس سے بہت گڑ بڑ پیدا ہوچکی ہے۔ دنیاوی خواہشات کو ثانوی رکھیں، بس اولیت دینے کا عذاب ہے۔ صرف اتنی دنیا درکار رہے کہ کھانے پینے اور سونے کو مل جائے۔ بے روزگاری کوئی لفظ نہیں، فقط جھوٹی شان کا مسئلہ ہے۔ آپ ﷺ کے صحابی کی شان تو ایک لکڑ ہارا بننے میں نہیں جاتی لیکن ہم خود کو پتہ نہیں کیا سمجھتے ہیں۔ یورپ والوں نے اسی وجہ سے ترقی کی ہے کہ انہوں نے جھوٹی شان چھوڑ دی۔ کفر اور اسلام کے دنیوی اصول تو ایک جیسے ہیں۔ ہمارا مسئلہ inertia ہے، ہم تو ایک محلے کو نہیں بدل سکتے۔ Initiative Principle اختیار کریں اور Inertia Principle ترک کر دیں۔ ایک dynamic soul ہوئے بغیر کام نہیں ہوتا۔ نہ دنیا میں، نہ روحانیت میں۔

۱۵۔ انسان کی خودی رہن رکھی ہے اُن افکار واعمال کی بدولت جو کہ اس نے earn کئے ہیں۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ بما کسبت رھینہ۔ انسان جو کچھ بھی اس دنیا سے لے کر جاتا ہے، وہی اس کی جنت یا دوزخ ہے۔ اور جو بوجھ آخرت میں اٹھانا ہے وہ خود ہم متعین کرتے ہیں۔ اس

لئے احساسِ ذمہ داری بنیادی نوعیت کی چیز ہے۔

کیا خبر کس وقت کس کی پُتلیاں پھِر جائیں گی

کون اپنے ساتھ کیا سود و زیاں لے جائے گا

حیات کے various levels and phases ہیں۔ اور ہر ایک level کا time and space مختلف ہے۔

۱) الستی زندگی ۲) ناسوتی زندگی ۳) برزخی زندگی

۴) روزِ حشر ۵) فیصلوں کے بعد کی زندگی

ناسوتی زندگی جو ہم گذار رہے ہیں یہ سب سے مختصر زندگی ہے لیکن آگے آنے ولی جتنی بھی زندگیاں ہیں ان کی خوبی و خرابی کا مدار اس ناسوتی حیات پر ہے اس لئے سارے levels سے زیادہ اہمیت اس کی ہے۔ کُل زندگیوں کے نتائج کا انحصار اس پر ہے۔ آنے والی زندگیاں کچھ بھی نہیں ہیں، بس اسی ناسوتی زندگی میں کاشت کیے ہوئے بیجوں کے ثمرات ہیں۔ الستی زندگی چاہے جتنی بھی طویل ہو، حشر کے بعد کی زندگی اُس سے کئی گنا لمبی ہے۔ انسان خود ہی اپنی بہشت ہے اور خود ہی اپنی دوزخ۔ ایک جنت دوزخ future کی ہے اور ایک present کی بھی جنت دوزخ ہے۔ ہم آج بھی جنت میں ہیں یا دوزخ میں۔ اس اعتبار سے جنت اور دوزخ نقد ہے۔ حماقت سے انسان غلط شجر کاری کر بیٹھتا ہے کیونکہ اس کا خطرہ انسان کے ساتھ لگا ہوا ہے، اس لئے جنابِ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ والعصرِ انَّ الانسانَ لفی خُسر ۔لیکن جو اس آیتِ مبارکہ کے بعد والی شرائط پوری کر لے وہ کامیاب۔ الا الذینَ اٰمنوا یعنی جو ایمان لے آئیں اور تواصوا باالحق اختیار کریں یعنی وہ لوگ جنہوں نے The Truth کو اختیار کیا اور پھر تواصوا باالصبر یعنی جو حق ہے اس پر کامیابی سے ڈٹے رہے۔ دوسروں کو بھی حق کی طرف بلائیں اور پھر جو مصائب آئیں ان پر صبر سے قائم رہیں تو وہ کامیاب لوگ ہیں۔

۱۶۔ طبیعت کے اعتبار سے کسی چیز کی ضرورت یا تقاضا محسوس ہو تو یہ کوئی خراب

بات نہیں۔ طبعی سرور والم اور طبعی ردِ عمل پر کوئی قید نہیں لیکن عقلی و روحانی سطح پر سرور والم اور چیز ہے۔ طبعی ردِّ عمل جو بھی ہو لیکن فیصلہ عقلی و روحانی رویے سے ہو گا یعنی طبیعت کو کسی چیز سے تکلیف محسوس ہو لیکن rational and spiritual decison کے اعتبار سے وہ اَلم نہ ہے۔ کاملین وہ ہیں جو طبیعت، شریعت، طریقت، معرفت اور حقیقت سبھی کا حق ادا کرتے ہیں۔ الم ناک صورتِ حال میں بھی شرع شریف سے باہر نہیں جاتے۔ اس طرح کے لوگ multidimensional ہوتے ہیں۔ مصیبت تو single dimensional کو ہے۔ کاملین ہر dimension کا حق ادا کرتے ہیں۔ ایک channel کو off کر کے کسی اور channel کو on کر لینا کوئی کمال نہیں بلکہ ہر ہر channel کا حق ادا کرنا تو کوئی کمال ہوا۔ سورۂ یوسف سے مصائب و الم کی حقیقت سمجھیں۔ مصیبتیں صورتِ مصیبت ہوتی ہیں۔ حضرت یوسفؑ کا کنویں میں گرا دیا جانے اور پھر مصر کے بازار میں بیچ دیا جانا، یہ سب ایک strategy ہے دربار میں پہنچائے جانے کی۔ اب ہماری کوئی مصیبت زندانِ یوسف کے مساوی تو نہیں ہو جائے گی۔ حضرت یوسفؑ کی تمام تر کامیابیوں نے مصائب سے جنم لیا۔ اس لئے ہم مصائب آنے کی صورت میں اپنے عقلی اور روحانی balance کو قائم رکھیں۔ ایمانی حالت تو یہ ہو، طبیعت چاہے جو رہے۔ غیر اختیاری اُمور میں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اسی طرح واردات و کیفیات محمود تو ہیں لیکن مقصود نہیں۔ عقلی، اختیاری اور مقصود ۔ ان الفاظ کو یاد رکھیں۔ حقیقی مصیبت اس دنیا میں معصیت کے سوا کچھ اور نہیں۔ اس اُصول کو مدِّ نظر رکھیں۔

۱۷۔ تصوف ہی نہیں بلکہ جہاں بھی اصولِ تربیت ہے وہ یہی ہے کہ خود رائی چھوڑنی ہے۔ آدمی جب اپنے احوال کی کال کوٹھڑی میں رہ کر منظر دیکھتا ہے تو پھر بہت خرابی پیدا کرتا ہے۔

مقامِ نور سے دیکھیں تو کچھ سُراغ ملے
کہ کس مقام کی ظلمت ہے کس جہاں کے لئے

کم از کم ایک آدمی ایسا ہو زندگی میں کہ جس پر مکمل بھروسہ ہو۔ پھر اس کی غلط رائے بھی آپ کو فائدہ دے گی۔ اس کی بات چاہے غلط نظر آ رہی ہو لیکن وہ بدخواہی پر مبنی نہیں ہو گی۔ شیخ کی بات سے اپنے

مفادات کوزَک پہنچتی محسوس ہوتی ہے حالانکہ وہ مفادات مفروضہ ہوتے ہیں،لیکن آدمی کو اپنے تجزیے پر ناز آجاتا ہے اور یہ بے جا ناز آدمی سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین لیتا ہے۔اس لئے آخر میں کسی پہ کیا گیا اعتماد ہی کام آتا ہے۔

۱۸۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی دعا اڑھائی ہزار سال بعد پوری ہوئی لیکن ہمیں ہی جلدی پڑی ہوتی ہے۔قبولیتِ دعا میں ایک یہ بات پیشِ نظر رکھ لیں تو بہت بڑی بات ہے۔جنابِ حق تعالیٰ کے کرم کی صورتیں بہت عجیب ہیں۔بہت سے کام ہمیں ستم محسوس ہوتے ہیں لیکن بہت آگے جا کر پتہ چلتا ہے کہ وہ تو کرم کی انتہا تھی۔جس بات کو ستم سمجھ رہے ہیں اسی میں نفع ہے۔روحانی نفع بھی تو ایک چیز ہے،نفع صرف مادی نوعیت کا نہیں ہوتا۔ہوسکتا ہے کہ حق تعالیٰ تربیتِ نفس اور پرورشِ روح فرما رہے ہوں۔اب نفع اور نقصان کی کسوٹی ہم نے اپنی بنا رکھی ہے۔جس غذا کی لذت اور توانائی سے شرارت اور بغاوت پیدا ہو وہ بدترین چیز ہے اور جس سے سوز وگداز آئے وہ بہترین۔ایک اور پہلو بھی ہے اس بات کا کہ شرارت تو نہ آئے لیکن شکر کی کیفیت بھی نہ آئے تو یہ ناشکری لکھی جائے گی۔ناشکری سے بڑی خباثت اور بغاوت کچھ نہیں۔اگر زیادہ دولت مقبولیت کی علامت ہوتی تو کیا (نعوذُ باﷲ) نمرود، ہامان،فرعون مقبول تھے؟ مال ودولت اور اقتدار کا ملنا ان تین دائروں میں سے کسی ایک دائرے میں ہوگا۔

۱) انعام ۲) آزمائش ۳) سزا

آزمائش کا مطلب ہے کہ امارت میں جس طرح رہ کر دکھانا چاہیے تھا اگر اس طرح رہا تو اس چیز کو انعام بنا دیا جائے گا ورنہ وہ سزا بنا دی جائے گی۔خلافتِ راشدہ کے بعد کا اقتدار آزمائش تھی اور اکثر و بیشتر سزا ہو کے رہی۔حضرت سیدنا عثمانؓ کو دولت ملے تو یہ اﷲ کے ان سے خوش ہونے کی دنیاوی نشانی ہے اور دولت اگر فرعون کو ملے تو یہاں دولت خدا کے ناراض ہونے کی دنیاوی علامت۔دنیاوی لذتیں کافروں کو زیادہ حاصل ہیں اور مستحقِ جہنم بھی بن رہے ہیں کیونکہ جب اﷲ کریم کا شکر نہیں ادا کرنا تو یہ آسائشیں عنایات تو نہ ہوئیں بلکہ سزا ہیں۔تموّل مقبولیت کی علامت نہیں۔

۱۹۔ منزل یابی کے لئے چلنا لازمی امر ہے اور چلنے کے تصور میں ٹھوکر کھانے کا امکان ہوتا ہے۔ٹھوکر کھانا دراصل چلنے کی دلیل ہے اور چلنا درحقیقت حیات ہے۔کسی کا ٹھوکر کھانا ہی ثابت کرے گا کہ وہ چلا ہے۔ٹھوکر کھانا گناہ نہیں بلکہ نہ چلنا یا ٹھوکر کھا کر گرے رہنا گناہ ہے چنانچہ توبہ نہ کرنا اصل گناہ ہوا۔حیاتِ ارضی کے starting point پہ ذرا غور کریں۔اگر ٹھوکر لگنا نہ ہوتا تو حیاتِ ارضی کا آغاز نہ ہوتا اور پھر نبوت اور شریعتوں کا ظہور کیسے ہوتا۔ترکِ شرع ہوگی تو عمل بالشرع والوں کا کوئی مفہوم ہوگا۔

مت عبادت پہ پھولیو زاہد
سب طفیلِ گناہِ آدم ہے

اگر گناہ نہ ہو تو ندامت نہ ہو۔ اور اگر ندامت نہ ہو تو پھر توبہ نہ ہو۔ اور اگر قبولِ توبہ نہ ہو تو غفورالرحیم کے غفورالرحیم ہونے کا پتہ کیسے چلے گا!

سنا ہے حشر میں شانِ کرم بے تاب نکلے گی
لگا رکھا ہے سینے سے متاعِ ذوقِ عِصیاں کو

صدورِ معصیت دراصل معصیت نہیں بلکہ گر کر دوبارہ اٹھنے کی جو صلاحیت وجود میں رکھی ہوئی ہے اسے بروئے کار نہ لانا اصل معصیت ہے۔عصیاں پر فتح پانے کے لئے ایک مسلسل جنگ ہے اور یہی عظمتِ آدم ہے۔فرشتے subject to err نہیں اور اسی لئے وہ غیر خلیفہ ہیں۔خلافت کی عظمت تو صرف انسان کو عطا کی گئی ہے۔

۲۰۔ شرک ایسا گناہ ہے جسکے معاف کئے جانے کو کوئی سوال نہیں۔شرک پر رحمانیت، رحیمیت اور شفاعت کا اُصول نہیں لگتا۔رحمت کا مفہوم یہ نہ سمجھا جائے کہ شرک بھی معاف کر دیا جائے گا۔شرک کو معاف نہ کرنا ہی رحمت ہے۔کفروشرک کے بعد بدعت باقی تمام گناہِ کبیرہ سے بڑا گناہ ہے۔ بدعت کا عذاب سارے کبیرہ گناہوں سے زیادہ ہے ماسوا کفروشرک کے۔ جب ایسا ہے تو شراب نوشی، زِنا، جوا جیسے کبیرہ گناہوں کی برائی معلوم کرنے سے پہلے بدعات کو معلوم کریں

تا کہ بے خبری میں بھی کہیں ان میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ Ignorance of law کو معاف نہیں کیا جاتا اور بدعت تو واضح قانون شکنی ہے۔ جب قانون توڑا ہے تو سزا تو ملے گی چاہے آپ اُس قانون کے واقف تھے یا نہیں تھے۔ اگر سزا نہ ملے تو سارا قانون درہم برہم ہو جائے۔ بدعت کی حقیقت یہ ہے کہ وہ کام جسے جنابِ شارعؑ نے دینی کام قرار نہیں دیا آپ اس کام کو دینی کام قرار دے رہے ہیں تو اس سے بات کہاں جائے گی! پہلے ایک سنت کو منہدم کریں گے تو اس جگہ ایک نیا کام introduce کیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ بدعت کو گناہِ کبیرہ سے بھی زیادہ خطرناک اور مہلک سمجھنا چاہیے۔ حدیثِ مبارکہ میں آتا ہے کہ کُلُّ بدعۃ ضلالۃ۔ مزاروں پر حاضری اور چیز ہے اور میلہ قطعی اور چیز۔ موجودہ عرس کے نظام کو پرانے عرس سے کوئی نسبت نہیں۔ اب مزاروں پر غیر اسلامی کام کئے جانے کی بھرمار ہے۔ سارے غیر دینی اور غیر شرعی معاملات مزاروں پر عرس کے نام سے ہو رہے ہیں جس سے بزرگانِ دین کی روح کو اذیت پہنچتی ہے۔ جن چیزوں کو مٹانے میں وہ زندگیاں کھپا گئے وہی ساری ممنوعات، بدعات اور معاصی وہاں ہوتے ہیں۔ اگر بدعات اور معاصی ترک نہیں کرنے تو تصوف کا نام کیوں لینا! جب دین اور تصوف کی جڑیں اُکھیڑنے کا کام کرنا ہے تو پھر پیری مُریدی کا معاہدہ کیوں کرتے ہیں! جو بدعات پہلے کر چکے ہیں اب انہیں چھوڑنا ہے۔ یہ پتہ چلانا ہے کہ کون سا کام غلط ہے اور کون سا ٹھیک اور پھر اُس پر عمل پیرا بھی ہونا ہے۔ ڈھول ڈھمکے، ڈانس اور دوسری کئی خرافات اب میلوں پر ہو رہی ہیں۔ ہم اُنہیں روک نہیں سکتے لیکن ہم خود تو اس کا حصہ نہ بنیں۔

۲۱۔ مئے پندار سے اﷲ محفوظ فرمائیں۔ اس کی ایک بوند اندر جاتی ہے تو آدمی کا غرور دیکھنے والا ہوتا ہے۔ مال ومتاع ومنصب کے پندار سے منصبِ مشیخت کا پندار بڑھ جاتا ہے۔

حیاتِ انسانی

مادی / جسمی ✗ عنصری / باطنی / قلبی / روحی

I انسان = حیاتِ ظاہری

II جس طرح حیاتِ ظاہری
حالتِ مرض اور حالتِ شفا
اسی طرح حیاتِ باطنی / روحانی میں
حالتِ مرض اور حالتِ شفا

III حیاتِ معنوی میں ازالۂ مرض اور تخلیقِ شفا
انسان کا اصل کام اصلاحِ نفس، ذہن، دل

IV حیاتِ عنصری — گرفتاری / حالتِ مرض — آزادی / ازالۂ مرض تخلیقِ شفا / حالتِ شفا / Freedom

دل کا علاج

(۱) ذہن
(i) تشکیک / بے یقینی — یقین
(ii) انتشارِ فکری — وحدتِ فکری
(iii) بے مقصدیت — مقصد کا تعین / نصب العین کا تعین / بامقصدیت

(۲) نفس
(i) کبر — Humility تواضع / انکسار، عجز و نیاز
(ii) حرص — قناعت
(iii) بخل — سخاوت
(iv) حسد — سرور

Mind
جذبات
جبلی وجدان
ادراکِ عقل
جذبۂ جمال
[illegible]

نُشور

(شعری کلام)

حمد

اے میرے خدا اے مرے ممدوحِ محمد
حمدوں سے وراء اے مرے ممدوحِ محمد

تو ہاتھ بھی ملفوظ بھی قرطاس و قلم بھی
پھر ان سے جدا اے مرے ممدوحِ محمد

اک دن یہ کرم ہو کہ میں بن جاؤں سراسر
بس دستِ دعا اے مرے ممدوحِ محمد

میں صرف ترے فیصلوں کی گنبدِ جاں میں
لوٹ آتی صدا اے مرے ممدوحِ محمد

اک تُو یا ترا عکس کہیں صبحیں نہ شامیں
میں ایسا خلا اے مرے ممدوحِ محمد

تُو علم بھی معلوم بھی عالم بھی ازل سے
معلوم ہوا اے مرے ممدوحِ محمد

اِسموں سے وراء تُو میں تجھے کیسے پکاروں
اِسموں سے وراء اے مرے ممدوحِ محمد

قرآن ترا نورِ تکلُّم اُفق اُس کا
بس کوہِ حرا اے مرے ممدوحِ محمد

دل تجھ سے نہ زندہ ہو تو خود اپنے لئے دل
اک دشتِ بلا اے مرے ممدوحِ محمد

منظر تری اک بنسری میں سرمدی نغمہ
تُو نغمہ سرا اے مرے ممدوحِ محمد

دن رات یہی آرزو کشکول میں زندہ
اک حرفِ رضا اے مرے ممدوحِ محمد

جب تیری مشیّت ہے تو پھر زخم و دوا کیا؟
کیا درد و شفا اے مرے ممدوحِ محمد

کیا جور و کرم بیم و رجا کُلفت و راحت
کیا لُطف و جفا اے مرے ممدوحِ محمد

پھر قربتیں کیا فرقتیں کیا ، کیا رہ و منزل
کیا شورِ درا اے مرے ممدوحِ محمد

بن جاؤں گا میں خود میں جہنم ہُوا مجھ سے
جس دن تُو خفا اے مرے ممدوحِ محمد

بس دیدۂ گریاں کے توسّل سے ہی ممکن
تنسیخِ سزا اے مرے ممدوحِ محمد

نیزے کی اَنی آخری رفعت یہی مذہب
اُسلوبِ وفا اے مرے ممدوحِ محمد

اِک تیرا ہی تیرا رہے جانے میں رہے وہ
قیوم صبا اے مرے ممدوحِ محمد

دلِ عشق منزل

(میں اور تُو)

تجھے کون جانے، تجھے کون سمجھے

دلِ عشق منزل!

دلِ عشق منزل! یہ منزل وہ منزل کہ جس میں

تمنّا کہیں کی نہ ترکِ تمنّا

یہ منزل وہ منزل کہ جس میں

یسار و یمیں اور نہ اِمروز و فردا

نشاط و الم کے معانی

وفا اور جفا کے مطالب

مری اور تری فرقتوں، قربتوں کے مباحث

لُغت کے مخالف

دلِ عشق منزل!

دلِ عشق منزل

تجھے کون جانے، تجھے کون سمجھے؟

نعت

اپنے اللہ سے فقط آپؐ کا در مانگتا ہوں
آپؐ کے در سے فقیری کا ہنر مانگتا ہوں

مانگنے والوں نے جب مانگا تو کیا کیا مانگا
خاکِ پا آپؐ سے میں خاک بسر مانگتا ہوں

کچھ نہیں مانگتا بس آپؐ کی چوکھٹ کے لئے
اپنے شانوں سے جدا اپنا یہ سر مانگتا ہوں

دل سے طیبہ کی طرف کھلتے ہیں سارے رستے
سارے رستوں کا بیک لمحہ سفر مانگتا ہوں

آپؐ کے نام سے تعمیر ہو بس آپؐ سے میں
دل کے ویرانے میں اللہ کا گھر مانگتا ہوں

دل کے صحرا میں پرندوں کے یہ نوحے سنیے
ہر پرندہ یہی کہتا ہے کہ پر مانگتا ہوں

مانگتے رہنا بھی میں مانگتا رہتا ہوں صبؔا
مانگتے رہنے میں پھر اُنؐ سے اثر مانگتا ہوں

نعت

میں صاحبِ حیات محمدؐ کے نام سے
مجھ میں شعورِ ذات محمدؐ کے نام سے

پھر اُس کے بعد جتنی بھی باتیں رہیں رہیں
پہلے بس ایک بات محمدؐ کے نام سے

اُڑا تو پاؤں چھو کے مرے لوٹ جائے گا
زورِ تغیرات محمد کے نام سے

وہؐ مجھ میں جیسے تھالی کے پانی میں آسماں
میں بے قیود ذات محمدؐ کے نام سے

میں اُنؐ کی چاندنی میں ڈبو دی گئی ندی
یہ چودھویں کی رات محمدؐ کے نام سے

غزلیات

غزل

گذر سکے گی اُدھر سے نہ شب، چلے آؤ
عجب سحر ہے وہاں نئے بلب ، چلے آؤ

وہ چاندنی، وہ دروں پر گلاب کی بیلیں
وہ گھر، وہ صحن کرم ہے عجب ، چلے آؤ

بڑے پیار سے وہ انگلیاں سجاتی ہیں
قبا پہ تحفۂ گل ، بے طلب ۔ چلے آؤ

پُکارتے ہیں ہری دُوب کے ہرے ریشے
تنے ہو کب سے ، جھکو! آؤ ! اب چلے آؤ

گُلِ نشاط کھلا، چھپ گیا بتانے کو
میں عکسِ لب تھا ، بُلاتے ہیں لب ، چلے آؤ!

غزل

اُڑا کے لے گئی جانے کہاں ہَوا ، چہرے
کِھلے بہ موجِ تبسم حیا حیا ، چہرے

تمام نرگس و شبنم ، تمام آتش و سم
عجیب چہرے تھے یارو وہ صد ادا چہرے

سکوتِ شام کی پرچھائیوں میں بکھرے ہیں
نشاطِ ہمہمہ ساماں ، سحر نوا چہرے

نہ پھر وہ سایۂ عطرِ جنوں لئے گزرے
ہجومِ شہر میں شامل مگر جدا ، چہرے

طلوعِ رنگ بہ صحرائے زندگی ہیں صبا
کسی کے ہجر میں بے تاب نارسا چہرے

تھکے دلوں پہ چھڑکتے تھے نور منزل کا
شبِ سفر میں جدا سب سے شمع سا چہرے

غزل

سورج بھی نہیں بھڑکا ۔ بادل بھی نہیں ٹھہرا
میں راکھ نہ کہلایا ۔ جل تھل بھی نہیں ٹھہرا

اس رات بھی اے بارش! جنگل میں رواں ہوں میں
تو نے تو یہ دیکھا ہے ۔ میں کل بھی نہیں ٹھہرا

میں کیسے امر کرتا اک بہتے ہوئے دن کو
پانی مری مٹھی میں اک پل بھی نہیں ٹھہرا

اک ہاتھ کو منظر کی ترتیب ترستی ہے
داناؤں کو آنا تھا ۔ پاگل بھی نہیں ٹھہرا

تمثال کوئی ڈھونڈو اس شخص کی جو اب تک
دریا بھی نہیں ثابت ۔ چھاگل بھی نہیں ٹھہرا

اوجھل نہیں ٹھہرا وہ ۔ میں اسکی نگارش ہوں
اس نے مجھے لکھا ۔ میں ۔ اوجھل بھی نہیں ٹھہرا

یہ روح بچھا دی ہے ۔ اک ایسے بچھونے پر
جو آہنی چادر بھی ۔ مخمل بھی نہیں ٹھہرا

آغازِ تعارف سے پہلے بھی تو مجھ میں تھا
یہ لمحۂ اوّل ہی ۔ اوّل بھی نہیں ٹھہرا

اُس دیس پہنچ جاؤں اس قبر کے رستے سے
چند بے گنے میلوں کا ۔ یہ بَل بھی نہیں ٹھہرا

غزل

آنکھ سے پوچھ وہ سج دھج کے ملا بھی ہو گا
جو ترے علم میں نادیدہ خدا بھی ہو گا

لفظِ انکار جو لکھیں وہ مرے ہاتھ نہیں
تو جو چاہے ، تو میں لکھتا ہوں ۔ 'لکھا بھی ہو گا'

چپ کے جنگل ہی سے آ گے ہیں وہ رم جھم یادیں
اک نیا شہر بھی اور ابرِ صدا بھی ہو گا

اک سمندر کا بھنور ، آنکھ تھی ، اور ساحل سے
اَن کہی نے ، یہ کہا تھا ، کہ کہا بھی ہو گا

چاند بھی ، پھوار بھی ، دو جسم بھی ، دو روحیں بھی
نیم شب ہو گی ، وہی وقتِ دعا بھی ہو گا

پردہ داری کے وہ آداب تو سب جانتا ہے
کیا کبھی پچھلے پہر پردہ کشا بھی ہو گا؟

دل کا حصہ ہے ، ہواؤں کے اثاثوں میں نہیں
اک سفر تھا کہ سفر ہی میں ہُوا بھی ہو گا

میرے داتا ، مرا ہجویر ، مرا دل ہی تو ہے
جو ترے شہر سے آیا وہ ترا بھی ہو گا

جب زمینوں پہ جبینوں کی خدائی ہو گی
اک وہ سجدہ انہی سجدوں میں ادا بھی ہو گا

میری آنکھوں کی سجاوٹ ہیں محاسن جس کے
لوگ کہتے ہیں برا تھا تو برا بھی ہو گا

غزل

میں ازل کی سمت اُلٹی جست بھر جاؤں اگر؟
عالموں کو جیب میں ڈالے گزر جاؤں اگر؟

دے چکے تم حافظہ بھی ، سوچ بھی ، احساس بھی
میرے ہاتھوں میں ہے سب کچھ ، میں مُکر جاؤں اگر؟

میرے اک ذرے میں گم ہو جائیں یہ دونوں جہاں
ترک کر دوں مرتکز رہنا ، بکھر جاؤں اگر؟

تو ہے جس منجدھار میں اس کا سفر تو مجھ سے ہے
منجمد ہو جائے سب کچھ ، میں ٹھہر جاؤں اگر؟

دوسرے قالب میں آ جاؤں اسی پل سامنے
اک یہ سازش بھی اسی کمرے میں کر جاؤں اگر؟

تو پلک جھپکائے ، میں اپنے کنارے توڑ دوں
اور خلا کے ان گنت ملکوں میں بھر جاؤں اگر؟

یہ بھی ممکن ہے تجھے میں اتفاقاً ڈھونڈ لوں
ڈھونڈنے صدیوں سحر سے تا سحر جاؤں اگر؟

مرنے والوں کی صفوں میں ایستادہ اس جگہ
جینے والو! سوچتا ہوں ، میں اَمر جاؤں اگر؟

غزل

اِس مسافت میں مرا یہ بھی نہیں ۔ وہ بھی نہیں
سارے اُفقوں میں خدا یہ بھی نہیں ۔ وہ بھی نہیں

گُھپ اندھیرے کی ہواؤ! پانیوں کے فرش پر
خواہشوں کے نقشِ پا ۔ یہ بھی نہیں ۔ وہ بھی نہیں

دوریوں میں رُو نمائی ۔ قرب میں مستوریاں
اب مرا مقسوم ۔ کیا ؟ یہ بھی نہیں ۔ وہ بھی نہیں

تجھ کو تجھ میں دیکھ لوں یا آنکھ اپنی میچ لوں
اب مرا صدقِ دعا ۔ یہ بھی نہیں ۔ وہ بھی نہیں

گھومتے فلکوں میں ہلتی ڈولتی پرچھائیاں
اتنی سمتوں میں ۔ بپا یہ بھی نہیں ۔ وہ بھی نہیں

تیز لُو یادوں کی ۔ سوچوں کی نسیمِ نرم رو
اُس کے شہروں کی ہوا ۔ یہ بھی نہیں ۔ وہ بھی نہیں

غزل

ایک جنگل میں سرِ شام سنایا جاؤں
گیت بن کر تری آواز میں گایا جاؤں

ہر مُسافت کے اُفق تک میں بلایا جاؤں
پھر اسی راہ سے واپس تو نہ لایا جاؤں

کُفر کا شہرِ زمیں دوز ہوں ، ڈھایا جاؤں
اک فلک بوس کلیسا ہوں ، گرایا جاؤں

یہ تو چاہوں گا کہ معبود بنایا جاؤں
کارنس پر ہی نہ لیکن میں سجایا جاؤں

پہلے ہر ممٹی پہ ہنستا میں دکھایا جاؤں
اور پھر یوں ہو کہ موجود نہ پایا جاؤں

سنگِ بے چشم ہوں ، کس طرح رلایا جاؤں
میں فقط خاک کیا جاؤں ، اڑایا جاؤں

غزل

تجھے اپنا سمجھتے ہیں نہ اوروں کا سمجھتے ہیں
نہیں جب کچھ سمجھ پاتے تو ہم کیا کیا سمجھتے ہیں

ترے اشفاق خود ہم سے بھی ہم کو لے اُڑے ایسے
ترے ہوتے اب اپنے آپ کو تنہا سمجھتے ہیں

ہر اک منظر سے یوں آنکھیں چُراتے ہیں کہ جیسے ہم
سحر بن کر شبِ رفتہ کا لوٹ آنا سمجھتے ہیں

شبِ رفتہ کا لوٹ آنا سحر بن کر دبے پاؤں
کچھ ایسے خود کو ہر منظر سے بیگانہ سمجھتے ہیں

اُسی دنیا کو اب تو اک نئی دنیا سمجھتے ہیں
کچھ ایسے خود کو اب ہم خود سے بیگانہ سمجھتے ہیں

اُسے غم تھا کہ خود اپنے کرم کی سمت پہچانے
اُسی غم کو ہم اب تک رنجشِ بے جا سمجھتے ہیں

غزل

میں کہ نا موجود ہوں ، حاضر بھی ، ہر منظر میں ہوں
بھاگتے پانی میں ساکت ہوں رواں پتھر میں ہوں

سُن رہا ہوں شور میں چھوڑے ہوئے ساحل کی چُپ
میں خود اپنے پار کے اک ساحلی منظر میں ہوں

پیکروں کے درمیاں رفتارِ لاپیکر بھی ہوں
پیکروں سے دور میں زندہ اسی پیکر میں ہوں

جی رہا ہوں ان گنت شکلوں میں ۔ دو شکلیں ہیں یہ
فاختہ کی چونچ میں ہوں ۔ دیدۂ اژدر میں ہوں

ہر نئے پل دائرہ در دائرہ میں گامزن
دل میں ۔ دُنیا میں ۔ خلا میں ۔ قبر میں ۔ محشر میں ہوں

دور تک بکھرا ہوا ہوں میں سمٹنے کے لئے
برف کی سِل میں ۔ ہوا میں ۔ ریت میں ۔ اخگر میں ہوں

میرے دشمن کے تعاقب میں ہیں ساری بستیاں
میں بڑے آرام سے سویا ہوا بستر میں ہوں

میرے آنسو بھی ہیں مجھ سے دُور اک رُومال میں
میں بھی اُن سے دُور اک رقصِ نشاط آور میں ہوں

غزل

پھول شعلوں کی ہتھیلی پہ بھی مہکا ہوتا
اُن کے ہونے سے نہ گنواؤ کہ کیا کیا ہوتا

درد ہی آج وہ جاگا ہے کہ یہ جُرم ہوا
دل نے چاہا کہ نہ اتنا تجھے چاہا ہوتا

کم نگاہی ترا اُسلوبِ کرم ہے شاید
کاش تجھ کو تری آنکھوں سے بھی دیکھا ہوتا

نظمیں

اللہ نورُ السمٰوٰت والارض

(God and the Cosmos)

ساری فضا اور ساری فضا میں اک سورج کی روشنیوں ہی
روشنیوں کا منظر۔ روشنیوں کا حسنِ تکلّم۔ ایک اکلوتا
سورج۔ اس سورج کی ساری کرنیں اپنے آپ میں سورج،
سورج اپنے آپ میں، اپنی ساری کرنوں میں کی
جدا جدا ہر ایک کرن میں ایک ہی سورج، اپنے آپ میں
اپنے آپ سے، اپنے آپ کو ایک ہی سورج، ایک ہی سورج۔
کرنیں قوس وقزح میں، قوس وقزح میں کرنیں
سورج، کرنیں، قوس وقزح بھی اپنے سارے رشتوں
میں رنگوں، رنگوں اک سورج کے ایک ہی سورج ایک
ہی سورج ہونے کی ایسی گواھی، ایسی زندہ ٹھوس گواھی
جس کے مُنکر، اپنے ہی انکار میں اک سورج کے ایک
سورج ہونے کی، زندہ ٹھوس گواھی۔
سورج، کرنیں، قوس وقزح، یہ تین نہیں، یہ تین نہیں
تینوں ایک ہیں، تینوں ایک ہیں، سورج، سورج، سورج۔

حُسنِ تکلّم

سورج بولا: 'سورج، سورج، سورج'
کرنیں بولیں: 'سورج، سورج، سورج'

قوس وقزح بھی بولی: 'سورج، سورج، سورج'
قوس وقزح کے سارے رنگوں،
رنگ رنگ کے رنگوں کی بھی واحد بولی 'سورج، سورج، سورج'
ساری فضا اور ساری فضا کی ساری لہریں،
لہروں لہروں ایک ہی بولی 'سورج، سورج، سورج' ۔

توحید

پھول اور کانٹے کے اضداد میں کیا کیا ہے نہاں؟
ان کی روحوں میں ہے کس طور کے دریا حائل؟
اِک اِک چیز کے دریاؤں کا حائل پانی،
جُھٹپٹوں، دھوپ، اٹل رات کی چُپ اور مجھ سے
جانے کس چیز کا ہے لمحہ بہ لمحہ سائل؟!!

اِن سوالوں کی تپش کا بھی ہو کوئی ساحل

پھول ہیں زینۂ انفاس پہ جمتی مٹی؟!!
خار ہیں مہکی نمی نشو و نما کے دل کی
کوکھ میں وہم کی ہے زہرا نہی جھگڑوں کا
جانے اک دوسرے کے جی کی تڑپ ہیں دونوں
یا بجھی راکھ ہیں اس دنیا کے سب قصّوں کی
دل کے اپنے ہی کسی جھوٹ کا پَرتو یا پھر
ہیں یہ بے لفظ خبر اک نئے آب و گل کی؟
آج اس بحث کے پاتال میں اُترا تو وہاں
مُجھ سے کہتا تھا کوئی اپنے لہو میں ڈوبا
'ایک دل اور بھی موجود ہے تجھ میں پسِ دل
زخمِ اضداد کا مرہم، مگر اپنا قاتل!'

پہیلی

یہ ایک سوکھی نحیف ذی روح پنکھڑی ہے
جو دل کی میلی سیاہ سَلوٹ میں اتنے آرام سے مکیں ہے
(اسے میں بس ایک پنکھڑی ہی کہوں گا۔ بس ایک پنکھڑی ہی)

ہر ایک شے تھی اڈتے دریا کا وہ کنارہ
اُڑا کے لے جائے جس کنارے کی ریت پل میں
کسی بھی چنچل ہوا کا جھونکا
کوئی کنارہ جو ٹوٹ جائے
تو سب طرف سے اُبل پڑے اک اٹل اندھیرا
اٹل اندھیرے کے سیلِ بے مہر کا بہاؤ
اُڑا کے لے جائے ایک پل میں
ترا مرا یہ عجب تعلق،
یہ بِھیڑ دنیا کی اور عدم کا یہ نیم اُجالا۔
اٹل اندھیرے کے سیلِ بے مہر کا بہاؤ
یہ ہم، یہ دنیا کی بِھیڑ اور یہ عدم بھی جِسکی
بس ایک موجِ حقیر ٹھہرے
بہا کے لے جا سکا نہ اس ایک پنکھڑی کو
یہ ایک سوکھی نحیف ذی روح پنکھڑی ہے
مرے اکھڑتے ہوئے یہ پاؤں اسی نے پکڑے

اُجالا

تری مسکراہٹ یہی پوچھتی تھی: اجالے کا مفہوم کیا ہے، مگر میں اندھیرے اجالے کی
باتیں بھلانے کا عادی رہا ہوں۔ تو لو میں گلہ دور کر لوں کہ میری زباں آخرالامر کھجلائی
ہے آج کچھ کچھ۔ سُنو، کچھ مرے پاس آ کر سُنو تم! یہ اک ریشمی پیلا باریک تاگا کہ
جسکی عدم اک گرہ ہے۔ مجھے اس پر چلتے ہوئے ڈر بھی آئے تو مت سوچنا دل ہی دل
میں، اندھیرے کا دریا مجھے دیکھنا پڑ گیا ہے، وہ دریا مجھے دیکھنا پڑ گیا ہے: کہیں
قرنوں پہلے گرے قرمزی کوئلے کی حرارت سے اب تک اُبلنے کی لذّت کا جو ایک دل شاد
رہا ہے۔ اسی بات پر تم ہنسے تھے کہ دریا بھی اک کوئلے کو بجھاتا نہیں ہے۔ مگر میں
تو تاگے کے پُل پر، فقط سامنے ہی نگاہیں لگائے چلا ہوں کہ دائیں نہ بائیں مجھے دیکھنے کو کہا
تھا۔ نہ اب مجھ سے کہنا کہا تھا یہ کس نے؟ تو للہ اب مان لو کہ مرا ڈر اجالے سے تاریکیوں
سے، زمیں آسماں، مجھ سے تم سے الگ ہے۔ مرے ہاتھ سے گر پڑی تو مرے ہاتھ سے گر پڑی
وہ چھڑی جو کبھی دی تھی تم نے۔ یہ گرنے کی بے لفظ آواز دل کو عجب طرح سے کیوں سجھاتی
ہے بے مہر بن کر کہ تم ایک جُھوٹوں کے جُھوٹے۔ تمہارے یہ سانسوں کی آواز، پاؤں کی ہر چاپ،
پلکوں کے سائے اندھیرے کا دریا نہیں ہیں تو کیا ہیں؟!! مجھے تو اب اچھی طرح یاد بھی یہ نہیں، آنکھ
جھپکی تھی کیوں چلتے چلتے کہ دائیں نہ بائیں مجھے دیکھنے کی کبھی ایک پل کو بھی ہمت ملی اور وہاں
سامنے تو بس ایک نقطہ ہے جس کے لئے ہر اندھیرے اجالے کا سایہ نجس ہے مجھے کیا خبر ہو
کہاں ہے یہ نقطہ کہ تاگے کے پُل کی عدم اک گرہ اور مری سوچ کی آخری حد عدم سے بھی کوسوں
اِدھر ہے۔ تو آنکھیں سمجھنے ہی کا جرم اب یاد آتا ہے، اس پل کسی قطرۂ خوں نے جی میں
یہ سمجھا تھا: تاگے کے پُل کے دورویہ اندھیرے کے دریا پہ جیسے فرشتوں کے نوریں پروں
نے گزرتے گزرتے بنائے تھے کچھ لہریے سے۔ مگر دائیں بائیں نہ دیکھا تھا میں نے۔ تو آنکھیں جھپکنے
ہی کے جرم کی یہ سزا ہے کہ سانسوں کی آواز، پاؤں کی ہر چاپ، پلکوں کے سایے اندھیرے کا

دریا ہیں زیادہ نہ کم لطف کی بات یہ ہے!! تو یہ ریشمی پیلا تا گا کہ جسکی عدم اک گرہ
ہے۔ اندھیرے کا دریا ہے زیادہ نہ کم یاد رکھیں گے سب یہ! مجھے اک تحیّر ہے لیکن، کہ اب تک
اندھیرے کے دریا کی تہہ میں یہ سایوں کی شطرنجیوں کے سمٹنے کا اور پھیلنے کا عجب کھیل جاری
ہے کیونکر؟ اندھیرے میں سایوں کا ہونا لطیفہ نہیں کیا؟ اگر مان بھی لیں اُسی ریشمیں پیلے باریک
تاگے پہ پاؤں جمائے چلے جا رہے ہیں۔ تو انکار ممکن نہیں ہیں کہ یہ ریشمیں پیلا باریک تاگا اک ایسے
ہی دریا کا پُل ہے۔ پہاڑوں سے پھوٹا نہ جا کر گرے گا کسی بھی سمندروں میں جو آخرالامر اک دن،
اور اس طولِ دریا کے جس پاٹ پر پیلے باریک تاگے کا پُل پہلے دن ہی سے سایہ کناں ہے۔ خود اس پاٹ
کا بھی نہ آغاز و انجام دیکھا کسی نے۔ اور اک ایسا نقطہ کہ جسکے لئے ہر اندھیرے اجالے کا سایہ نجس
ہے، اُسے دل ہی میں ڈھونڈنے کا نہیں کوئی یارا۔ نہ یارا اگر ہو یہ دل کو تو سانسوں کی آواز،
پاؤں کی ہر چاپ، پلکوں کے سائے عدم کی گرہ ہیں، اندھیرے کا دریا ہیں، مانو! اور اسطرح
موجودگی ہی نہیں پیلے تاگے کے پُل پر جب اپنی تو خود روشنی میں بھی کیسے یہ سایوں کی شطرنجیوں
کا عجب کھیل جاری ہے، کہ خود روشنی بھی کسی چیز ہی کی ہے محتاج سایوں کی خاطر!
اندھیرے اجالے میں سایوں کی شطرنجیوں کا عجب کھیل جاری ہے کیونکر۔

نوٹس:۔

نوٹس:۔

نوٹس:۔

نوٹس:۔

نوٹس:۔

نوٹس:۔

حضرت عبدالقیوم صبا رحمتہ اللہ علیہ

تعارف

حضرت عبدالقیوم صباؔ رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۳ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں ایک راجپوت گھرانے میں آنکھ کھولی۔ آپ کے والدِ گرامی جناب راؤ خورشید علی خاں گورنمنٹ کالج ساہیوال میں لیکچرر تھے۔ اوائلِ عمری میں ہی آپؒ کے والدِ گرامی اِس دارِفانی سے کوچ فرما گئے اور آپؒ کی کفالت اور تعلیم و تربیت آپؒ کے دادا جان نے فرمائی۔ ادب سے مناسبت کی بدولت Oriental College Lahore (Punjab University) سے ایم اے اردو ادب کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۶۷ء میں بطور لیکچرار دو ناظم آباد کالج کراچی میں آپ کی تقرری ہوئی۔ ۱۹۷۰ء میں آپؒ کا تبادلہ گورنمنٹ کالج ساہیوال میں ہو گیا اور ۲۰۰۲ء میں آپ بطور پرنسپل گورنمنٹ کالج ساہیوال retire ہوئے۔ جدید و قدیم ادب، فلسفہ اور کلام پر آپ کو مکمل دسترس حاصل تھی جس کا عکس اس کتاب میں بخوبی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ خالق و مخلوق، حادث و قدیم اور پھر حیات و کائنات کے اسرار و مفاہیم سے آشنائی اور حقیقتِ عظمٰی سے ہمکلامی اور ہمکناری کی ازلی ابدی پیاس کی سیرابی فلسفہ اور کلام کے مباحث سے کیسے اور کیونکر ممکن تھی! کسی شیخِ کامل کی تلاش جاری تھی کہ حضرت سید سلیمان ندویؒ کی سوانح تذکرۂ سلیمان آپؒ کی نظر سے گزری اور مطالعے کے دوران ہی فیصلہ فرما لیا کہ اس تذکرہ کے مصنف حضرت ڈاکٹر غلام محمدؒ (خلیفہ مُجاز حضرت سید سلیمان ندویؒ) سے بیعت کی جائے۔ آپؒ نے حضرتِ والا ڈاکٹر غلام محمدؒ کو بذریعہ خط اپنی خواہش سے آگاہ فرمایا اور اُدھر سے حضرتِ والا ڈاکٹر غلام محمدؒ نے خود کراچی سے ساہیوال تشریف لانے کے ارادے سے آپؒ کو مطلع فرمایا۔ ۱۹۷۶ء کی صبح حضرتِ والاؒ ساہیوال اسٹیشن پر اترے، خود حضرت عبدالقیوم صباؔ فرماتے ہیں کہ حضرتِ والاؒ کے چہرے پہ نظر پڑی اور بس انہی کے ہو گئے۔ ۱۹۸۴ء میں آپؒ کے شیخِ عالی مقام نے خلافت عطا فرمائی۔ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا پیغام خلقِ خدا تک پہنچانے اور اُن کی زندگیوں میں جاری و ساری کرنے کی جدوجہد میں آپؒ کے شب و روز گزرے۔ آپؒ کی ذاتِ اقدس میں سلوکِ نبوی کا رنگ اپنی پوری قوت سے موجود تھا۔ اپنے خالق و مالک سے محبت اور اپنے خالق و مالک کی محبت میں اپنے خالق و مالک کی مخلوق سے بھی محبت، بس یہی آپؒ کا مشرب تھا۔ نو اکتوبر ۲۰۱۱ء کو آپؒ اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔